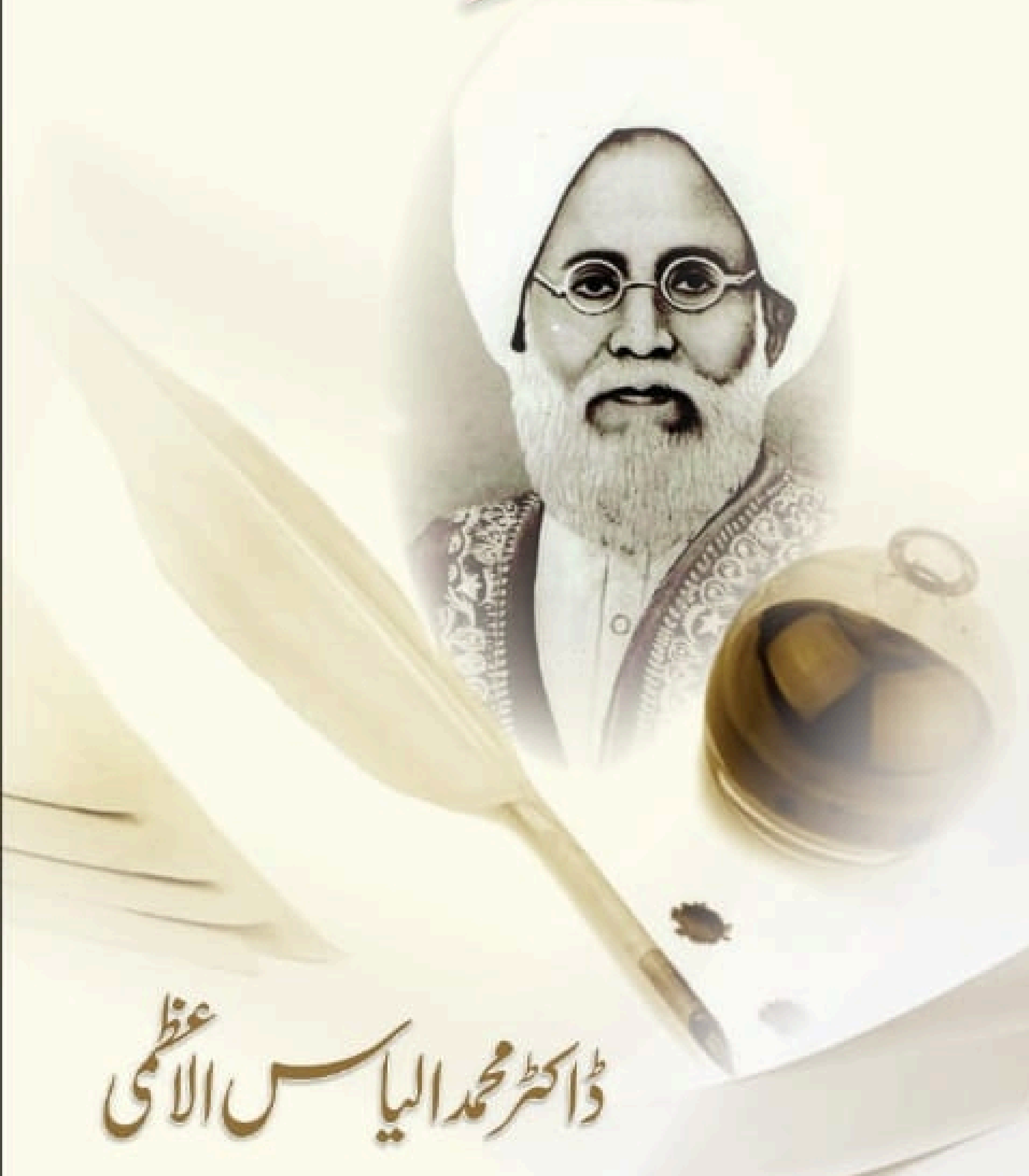
۱

بیانِ شبلی



ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

بیانِ شبلی

(۱)

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

بسم الله الرحمن الرحيم

بیان شبلی

(۱)

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

ادبی دائرہ اعظم گڑھ

○ کتاب : بیان شبلی۔(۱)
○ مصنف : ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی
○ ناشر : مصنف
○ باراول : ۲۰۲۱ء
○ مطبع : اصیلہ پرنٹرس، نئی دہلی

BAYAN-E-SHIBLI-1

Dr. Mohammad Ilyas Azmi
azmi408@gmail.com
+919838573645

Page 208 Rs : 300/-

ISBN

○ ملنے کے پتے
○ مکتبہ دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۷۶۰۰۱
○ مکتبہ جامعہ اردو بازار جامع مسجد دہلی۔ ۱۱۰۰۰۶

○

گرامی قدر

ڈاکٹر سلمان سلطان

کی نذر

○○○

ترتیب

○○○

دیباچہ

علامہ شبلی[۱۸۵۷-۱۹۱۴ء] کی جامع کمال شخصیت اوران کے عظیم الشان کارناموں پر راقم نے گذشتہ دو دہائیوں میں متعدد علمی وتحقیقی کتابیں اوردرجنوں مقالات سپردقلم کئے،جن کے تین مجموعے''متعلقات شبلی''،''شبلی اور جہان شبلی''اور''نقوش شبلی''علی الترتیب ۲۰۰۸ء،۲۰۱۵ءاور ۲۰۲۰ء میں شائع ہوئے۔ان مجموعہ ہائے مقالات کی اشاعت کے بعدبھی رسائل وجرائد میں مقالات کی اشاعت کا سلسلہ جاری رہا۔اب ان مقالات کونئے نئے ناموں سے شائع کرنے کے بجائے ایک نئے سلسلہ مضامین''بیان شبلی''کےتحت شائع کرنے کا فیصلہ کیا گیاہے۔زیرنظرمجموعہ ''بیان شبلی'' کا پہلا حصہ ہے۔اس میں کل ۱۱رمضامین ومقالات شامل ہیں اورتمام مقالات علامہ شبلی کی شخصیت کےکسی نئے پہلواور نئے گوشے سے متعلق ہیں اوران میں متعدداورمتنوع جدید مطالعات وتحقیقات شامل ہیں۔

بیان شبلی کا پہلا مقالہ''تصوف'' دراصل علامہ شبلی کاایک نادرخطبہ ہے۔ جوانہوں نے خواجہ حسن نظامی[۱۸۷۶-۱۹۵۵ء] کی فرمائش پر دہلی میں ان کے حلقہ مشائخ میں دیا تھا۔اس تقریب میں تقریباً دوہزارافراد نے شرکت کی تھی۔جس میں عمائدین دہلی بھی شامل تھے۔اس اجلاس کی صدارت امام جامع مسجد دہلی نے کی تھی۔یہ خطبہ ماہنامہ نظام المشائخ دہلی جنوری ۱۹۱۰ء کے شمارہ میں شائع ہوا ہے۔راقم کوعرصہ سے اس کی تلاش تھی۔لیکن صحیح تاریخ اشاعت کاعلم نہ ہونے اورنظام المشائخ کےشماروں کی کمیابی کےسبب اس کے ملنے میں برسوں لگ گئے۔ بلاشبہ یہ بے حد اہم خطبہ ہے۔اوراس لحاظ سےبھی بے حد اہمیت رکھتا ہے کہ یہ تصوف کے موضوع پرعلامہ شبلی کاواحدخطبہ ہے۔دوسرے امورتصوف کے ساتھ وحدۃ الوجوداوروحدۃ الشہو دکی اجمالی تشریح بھی ہے۔اسے مختصرنویسوں نےنقل کیاہے۔ظاہر ہے اسے حرف بہ حرف شبلی کا تو نہیں قراردیا

جا سکتا، لیکن یہ بہرحال انہیں کے افادات پر مبنی ہے۔

یہ خطبہ تصوف اور علامہ شبلی کے حوالہ سے خاص مطالعہ و تحقیق کا موضوع بن سکتا ہے۔ راقم نے خطبہ نقل کرنے سے پہلے چند سطور میں اس کا پس منظر اور اس کی روداد خواجہ حسن نظامی اور ملا واحدی [۱۸۸۸-۱۹۷۶ء] کے حوالہ سے قلم بند کی ہے۔

علامہ شبلی کے نام معاصرین کے خطوط: مسائل و مباحث اس جلد کا ایک نہایت اہم اور طویل ترین مقالہ ہے۔ یہ مقالہ علامہ شبلی کی کئی حیثیتوں کو اجاگر کرتا ہے۔ انجمن ترقی اردو کے وہ پہلے سکریٹری تھے۔ اس کے لئے ابتدائی دور میں انہوں نے جو جدو جہد کی اس کی ایک جھلک اس مقالہ میں آ گئی ہے۔ اسی طرح تحریک وقف علی الاولاد علامہ شبلی کا ایک اور بڑا عظیم الشان کارنامہ ہے۔ اس میں انہوں نے کامیابی کے خیال سے ہندوستان کے متعدد مشاہیر قانون دانوں اور ملت کے بہی خواہوں کو شامل کر لیا تھا۔ اس سلسلہ میں عمائدین کے درمیان جو خط و کتابت ہوئی، جو رائیں سامنے آئیں اور جو کارروائیاں ہوئیں، اس کی ایک داستان بھی اس مقالہ میں آ گئی ہے۔ اس مقالہ کے دیگر اہم امور میں جرجی زیدان کی ابلہ فریبیاں، ندوہ اور ماہنامہ الندوہ جیسے اہم موضوعات بھی زیر بحث و مطالعہ آئے ہیں۔ اس میں علامہ شبلی کی بعض بڑی بیش قیمت اور نادر و نایاب تحریریں بھی شامل ہیں۔ یہی نہیں اس میں متعدد اہل علم، ارباب کمال اور امراء و روسا اور والیان ریاست کے خطوط اور ان کے اقتباسات بھی نقل کئے گئے ہیں۔ دراصل یہ ایک مقالہ نہیں بلکہ مستقل کتاب کی حیثیت رکھتا ہے جو ''بیان شبلی'' کی اس جلد میں سمیٹ دی گئی ہے۔

علامہ شبلی کے متعدد احباب و معاصرین سے ان کے علمی ربط و تعلقات کا ذکر گذشتہ کتب و مقالات میں آ چکا ہے۔ ایک مقالہ میں علامہ اقبال [۱۸۷۷-۱۹۳۸ء] کے ساتھ علامہ شبلی، ان کے جانشین مولانا سید سلیمان ندوی [۱۸۸۴-۱۹۵۳ء] اور دارالمصنّفین اور معارف سے اقبال کے دیرینہ اور علمی روابط کی تفصیل قلم بند کی گئی ہے۔ کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ علامہ اقبال دارالمصنّفین کی انتظامیہ کے مدۃ العمر رکن رہے اور رسالہ معارف اور دارالمصنّفین سے بے انتہا دلچسپی لی۔ ماہ نامہ معارف میں اپنی نظمیں اور غزلیں اشاعت کے لئے بھیجیں۔ دارالمصنّفین کے اشاعتی منصوبے میں ان کے آراء و خیالات شامل رہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اقبال شناسی پر پہلی کتاب ''اقبال

کامل'، دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی ہی نے پیش کی جو صاحب شعرالہند مولانا عبدالسلام ندوی [۱۸۸۳-۱۹۵۸ء] کے قلم سے ہے۔ اس کا شمار آج بھی اقبالیات کی چند بلند پایہ اور بنیادی کتابوں میں ہوتا ہے۔ راقم نے یہ مقالہ دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ کے ایک سمینار میں پیش کیا تھا۔

علامہ شبلی کے خطوط کی دریافت کا سلسلہ جاری ہے۔ ۲۰۱۳ء میں ''مکتوبات شبلی'' کی اشاعت کے بعد متعدد مطبوعہ اور غیر مطبوعہ خطوط شبلی دریافت ہوئے، جنہیں راقم نے گذشتہ سال ہونے والے مجموعہ مقالات ''نقوش شبلی'' میں شائع کر دئے ہیں۔ اس کے بعد مزید تیرہ نئے خطوط رسائل و جرائد سے ہاتھ آئے۔ ان کے مکتوب الیہ بھی نئے اشخاص ہیں۔ ظاہر ہے یہ نو دریافت خطوط ذخیرہ شبلیات میں ایک بے حد قیمتی اضافہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان میں بعض خطوط اپنے علمی مشمولات و مباحث کے لحاظ سے بھی بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ یہ قیمتی خطوط بھی بیان شبلی کی اس جلد اول کا حصہ ہیں۔

سیاسیات شبلی پر اگرچہ نسبتاً کم لکھا گیا ہے، لیکن ایسا بھی نہیں کہ سرے سے نظر انداز کر دیا گیا ہو۔ خود جانشین شبلی مولانا سید سلیمان ندوی نے حیات شبلی میں کسی قدر تفصیل سے اس پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ الگ پہلو ہے کہ ان کے نقطہ نظر سے عموماً اس لئے اختلاف کیا گیا کہ اس بحث میں سرسید پر نقد کیا گیا تھا۔ تاہم اختلاف سے اس کی اہمیت کم نہ ہوئی اور نہ ہو سکتی ہے۔ اس لئے کہ مولانا سید سلیمان ندوی نے علامہ شبلی کا جو سیاسی نظریہ پیش کیا ہے، دراصل وہی ان کا اصل نظریہ سیاسیات تھا۔ ہاں اس میں انہوں نے سرسید احمد خاں [۱۸۱۷-۱۸۹۸ء] کا جس طرح ذکر کیا وہ مناسب نہ تھا۔ راقم نے جو مقالہ لکھا ہے اس میں سوائے اس کے کہ اس کے استناد میں بعض نئے حوالے شامل ہیں اور کوئی نئی بات نہیں۔ ہاں یہ ضرور کوشش کی گئی ہے کہ جو بات ہے وہ صاف صاف سامنے آ جائے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ یہ جب سالانہ جشن اعظم گڑھ کے ہندی یادگاری مجلّہ میں شائع ہوا تو عموماً پسند کیا گیا۔

میرے ہم نام ایک جج الیاس احمد بڑے سخن فہم اور ادب شناس تھے۔ انہوں نے اردو اشعار کے دو انتخابات ''بہار'' اور ''گلہائے پریشاں'' مرتب کر کے شائع کئے۔ گلہائے پریشاں میں انہوں نے علامہ شبلی کے بھی چند اردو و فارسی اشعار منتخب کئے ہیں۔ ایک مضمون میں انہیں یکجا

کیا گیا ہے۔اس انتخاب کی اہمیت محض اس قدر ہے کہ ابتک علامہ شبلی کے کلام کا انتخاب نہیں ہوا ہے۔ ظاہر یہ کمی اس مختصر سی تحریر سے پوری تو نہیں ہوسکتی، مگر اہل ذوق کی توجہ اس جانب ضرور مبذول ہوجائے گی۔اوراسی غرض سے یہ مضمون لکھا بھی گیا ہے۔شعروں کے انتخاب سے رسوائی کا ڈر نہ ہوتا تو یہ اہم ادبی خدمت بھی میں خود انجام دیتا۔

علامہ شبلی کی اردو شاعری کا ایک اہم ادبی پہلوان کی تضمین نگاری بھی ہے۔مگر ابتک اس پر کسی اہل قلم نے کی توجہ نہیں ہوسکی ہے۔راقم نے اس کے دوسرے پہلو یعنی خود کلام شبلی پر جو تضمین ہمارے اردو و فارسی شعرانے کی ہے، ایک مضمون میں اس کا تعارف و تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔مرزا غالب کے بھتیجے سراج الدین خاں سائل دہلوی [۱۸۶۴-۱۹۴۵ء] سے لے کر کیفی اعظمی [۱۹۱۹-۲۰۰۲ء] تک کلام شبلی پر تضمین کا ایک بڑا خوب صورت سلسلہ ہے۔اس میں لدھیانہ کے ایک بانکے شاعر نور لدھیانوی نے خاصا اہم رول ادا کیا ہے۔اس مضمون میں کوشش کی گئی ہے کہ تضمین کی اہمیت کے ساتھ اس کا پس منظر بھی بیان کر دیا جائے۔اس میں کس قدر کامیابی ملی اس کا فیصلہ ناظرین کے ذمہ ہے۔

ایک صدی قبل ہندوستان میں اردو شارٹ ہینڈ کا غلغلہ بلند ہوا۔ظاہر ہے یہ ایک بے حد اہم اور مفید فن تھا۔اس کا ایک شعبہ کرسچین کالج لکھنو میں قائم کیا گیا۔ایک سال بعد کرسچین کالج نے اس کا پہلا سالانہ جلسہ منعقد کیا۔اس میں مرزا ہادی رسوا [۱۸۵۷-۱۹۳۱ء] کی خواہش پر علامہ شبلی بھی شریک ہوئے۔اس اجلاس کی صدارت اس وقت کے انگریز حاکم مسٹر ولسن ایم سٹریٹ نے کی۔علامہ شبلی نے اپنی تقریر میں اس فن کی اہمیت واضح کی۔ان کی تقریر کا ایک اقتباس اخبار زمیندار لاہور میں شائع ہوا تھا۔اس کے حوالہ سے ایک مختصر سے مضمون میں اردو شارٹ ہینڈ کے بارے میں خیالات شبلی پیش کئے گئے ہیں۔ان کے نادر خطبہ کا ایک اقتباس بھی نقل کیا گیا ہے۔ علامہ شبلی سے متعلق جس کتاب یا رسالے میں نقوش شبلی شامل ہوں، اس کی افادیت سے کون انکار کرسکتا ہے۔بیان شبلی کو یہ خصوصیت بھی حاصل ہے۔

ایک مقالے کا عنوان ''بیان شبلی'' بھی ہے۔اس میں علامہ شبلی، ان کی فکر و نظر، تصنیفات و تالیفات اور مختلف زبانوں میں ان کے تراجم وغیرہ سے متعلق نئی معلومات جمع کی گئی ہیں۔بلاشبہ

اس مقالہ میں جہان شبلی کی بڑی وقیع معلومات یکجا ہوگئی ہیں۔ یہ اپنی نوعیت کا ایک نہایت دلچسپ اور منفرد مقالہ ہے۔

دارالمصنّفین کا خواب علامہ شبلی نے ۱۹۱۰ء میں ندوے میں دیکھا تھا۔مگر اس کے آغاز کی نوبت سب سے آخر یعنی ۱۹۱۴ء میں آئی۔اسی سال ۱۸/نومبر کو انہوں نے وفات پائی۔ان کے لائق تلامذہ مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی اور مولانا مسعود علی ندوی [۱۸۸۹-۱۹۶۷ء] نے ان کے خوابوں کو تعبیر عطا کی۔ سیرت بھی مکمل کی اور دارالمصنّفین کو بھی بیت الحکمت بنایا۔ایک مقالہ جس کا عنوان ''شبلی کی بدولت'' ہے، اس میں دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا تعارف اور اس کے عظیم الشان علمی وتحقیقی کارناموں کا اگرچہ اختصار سے ذکر ہے۔تاہم اس کی بنیادی خصوصیات اور خدمات کی تفصیل اس میں آگئی ہے۔

راقم نے ۲۰۱۶ء میں ماہنامہ معارف صدی سال کے موقع پر ماہنامہ آج کل دہلی کے مدیر ڈاکٹر ابرار رحمانی کی فرمائش پر معارف کی سرگذشت پر ایک مختصر سا مضمون لکھا تھا، جسے آج کل دہلی نے اسی زمانہ میں شائع کر دیا تھا۔ جسے قارئین آج کل نے اسے بے حد پسند کیا تھا۔اس کی افادیت اور علامہ شبلی کے ایک دیرینہ خواب کی تاریخ ہونے کی بنا پر اس مضمون کو بھی بیان شبلی میں شامل کیا گیا ہے۔ ماہنامہ معارف اصلاً اس کے بانی مدیر مولانا سید سلیمان ندوی کا لازوال کارنامہ ہے۔ ماہ نامہ معارف کی اشاعت پر ایک صدی سے زاید کا عرصہ گذر چکا ہے۔اس کے بانی مدیر مولانا سید سلیمان ندوی سے موجودہ مدیر پروفیسر اشتیاق احمد ظلی صاحب تک دبستان شبلی کے تمام ممتاز اہل قلم نے اسے خون جگر سے سینچا ہے۔ان کی علمی وتحقیقی نگارشات بھی معارف کا حصہ بنیں۔ بلکہ واقعہ یہ ہے برصغیر کے تمام بڑے اہل قلم نے معارف میں اپنی تحریروں کی اشاعت کو قابل فخر تصور کیا۔اس کے مشمولات سے برصغیر کے ممتاز اہل علم اور صاحب فکر ونظر کی ایک فہرست تیار کی جاسکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا آوازہ وشہرہ ہندوستان کی سرحدوں سے نکل کر عالم اسلام بلکہ یورپ وامریکہ تک پہنچا اور اسے ایک مثالی مجلّہ تسلیم کیا گیا۔اس کا خواب بھی علامہ شبلی ہی نے دیکھا تھا اور اس کا ابتدائی خاکہ بھی وہ بنا گئے تھے۔

ماہ نامہ معارف کا جولائی ۱۹۱۶ء میں اجرا، مسلسل اشاعت اور بلند تحقیقی معیار، معارف کی

ایسی خصوصیات ہیں، جس کی مثال ہماری علمی صحافت کی تاریخ مشکل سے ملے گی۔ مذکورہ مضمون میں اس کی اجمالی تاریخ اور عدیم النظیر علمی وادبی خدمات کا انتہائی جامع مرقع پیش کیا گیا ہے۔ اجمال کے باوجود اس سے ماہ نامہ معارف کی پوری عظمت سامنے آجاتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ معارف نہ صرف علامہ شبلی کے خواب کی تعبیر ہے، بلکہ دبستان شبلی کی عظمت کے ساتھ اردو زبان کی تاریخ کا بھی ایک روشن مینار ہے۔ اب اس کی حیثیت کسی انسائیکلوپیڈیا سے کم نہیں۔ اس کے مشمولات کے اشاریوں سے جسے کئی حوصلہ مندوں ڈاکٹر شائستہ بیدار، ڈاکٹر سہیل شفیق اور ڈاکٹر جمشید احمد ندوی نے مرتب کیا ہے، اس کی اہمیت واضح ہو کر سامنے آتی ہے۔ اس مجموعہ میں شامل مضمون سے بھی اس افادیت کا پتہ چلتا ہے، اسی لئے اسے بھی شامل کیا گیا ہے۔

بحیثیت مجموعی ''بیان شبلی'' میں علامہ شبلی نعمانی کی سیرت وسوانح، شخصیت، عظمت اور ان کے لازوال متنوع اور گوناگوں کارناموں کے ساتھ متعدد نئے پہلوؤں کا بھی ذکر آ گیا ہے۔ اس سے خاص طور پر نو دریافت اطراف و جہات شبلی کی وسعت، ہمہ گیری اور اہمیت کے متنوع پہلو نگاہوں میں آتے ہیں۔ یقین ہے فکر شبلی کی تفہیم وترسیل میں یہ مجموعہ نہ صرف معاون اور مفید ثابت ہوگا بلکہ ذخیرۂ شبلیات میں بھی ایک اضافہ قرار پائے گا۔

بیان شبلی جلد اول کی تکمیل واشاعت پر میں اپنے رب کریم کا شکر بجالاتا ہوں کہ اس نے مجھے ایک اور مجموعہ مقالات پیش کرنے کی توفیق بخشی۔ اس خوشی کے موقع پر میں اپنے تمام احباب اور علم دوست حضرات کا خصوصی شکریہ ادا کرتا ہوں، جنہوں نے میرا کسی نوع سے تعاون کیا۔ برادرم مولانا عرفات اعجاز اعظمی کا ممنون کرم ہوں کہ انہوں نے کتاب کا اشاریہ بنا کر اس کی افادیت میں اضافہ کیا اور قارئین کی سہولت کا سامان فراہم کیا ہے۔ فجزاہ احسن الجزاء

آج ایک بزرگ کرم فرما مرحوم پروفیسر ریاض الرحمٰن خاں شروانیؒ کا بار بار خیال آرہا ہے اور لب پر ان کی مغفرت کی دعا ہے۔ انہوں نے ماہ نامہ کانفرنس گزٹ اور ماہ نامہ فکر ونظر علی گڑھ کے صفحات پر راقم اور اس کی کتابوں پر مسلسل نقد وتبصرہ لکھ کر اس قدر ہمت اور حوصلہ افزائی کی کہ کم از کم میری علمی زندگی میں اس کی دوسری مثال نہیں ملتی۔ وہ بڑے عالمانہ تبصرے لکھتے تھے اور سچ تو یہ ہے کہ تبصرے کا حق ادا کر دیتے تھے۔ ان کے ان الفاظ سے کہ ''میں نے سب سے زیادہ تبصرے

آپ کی کتابوں پر کئے ہیں'' دل میں فخریہ جذبات پیدا ہوتے تھے۔مرحوم نے میری پندرہ کتابوں پر تبصرہ لکھے ہیں۔جو ان کے تبصروں کے مجموعہ ''کتابوں کے درمیاں'' میں شامل ہیں۔دعا ہے کہ اللہ تعالی ان کے درجات بلند کرے۔

قدر دانی کے لئے میں اتر پردیش اردو اکادمی لکھنو کے ارباب حل وعقد کا نہایت ممنون اور شکر گذار ہوں کہ انہوں نے اردو اکادمی کے موقر انعام'' مسعود حسن رضوی انعام برائے تحقیق ۲۰۱۸ء'' سے سرفراز کیا اور اس ناچیز کی عزت افزائی کی۔میں مغربی بنگال اردو اکیڈمی کولکاتا کے ذمہ داروں کا بھی ممنون کرم ہوں کہ انہوں نے میری کتاب ''نوادرات شبلی'' کو اپنے معزز ایوارڈ ''جان گل کرسٹ ایوارڈ'' سے نوازا۔

دنیوی اعزاز واکرام سے بڑھ کر ایک مومن کی معراج کمال اخروی زندگی کی کامیابی ہے۔رب کائنات سے دعا گو ہوں کہ وہ عقبٰی کی زندگی میں بھی کامیاب اور سرخ رو کرے اور ان معمولی خدمات کو شرف قبولیت بخشے۔

ناچیز

محمد الیاس الاعظمی

مورخہ ۱۵؍اکتوبر ۲۰۲۰ء — ادبی دائرہ اعظم گڑھ

[۱]

تصوف

علامہ شبلیؒ کی ایک نادر تقریر

علامہ شبلی نعمانی[۱۸۵۷- ۱۹۱۴ء] کوخطابت کا خداداد ملکہ حاصل تھااور وہ اپنے عہد بے مثل ادیب وانشاء پرداز ہی نہیں ایک منفرد خطیب ومقرر بھی تسلیم کئے جاتے تھے۔اعظم گڑھ تو ان کا وطن ہی تھا،علی گڑھ، حیدرآباد، دہلی، بھوپال، لکھنو، رام پوراور بمبئی کے متعدد اجلاسوں اور کانفرنسوں کو انہوں نے خطاب کیا۔ ایجوکیشنل کانفرنس میں بھی وہ برابر شریک ہوتے اور کسی موضوع پر تقریر کرتے یا قراردادیں پیش کرتے اور مباحثوں میں حصہ لیتے۔ان کے عزیز شاگرد مولانا عبدالسلام ندوی[۱۸۸۳-۱۹۵۶ء] نے ان کی خطابت کے بارے لکھا ہے کہ

> ''مولانا شبلی نعمانی جن اوصاف وخصوصیات کا مجموعہ تھے ان میں ایک خاص خصوصیت یہ تھی کہ ان میں زور تحریر کے ساتھ قوت تقریر کا ملکہ بھی پایا جاتا تھا۔ .... علی گڑھ جانے کے بعد جب ان کی پبلک زندگی کا آغاز ہوا تو اس ملکہ خداداد نے پوری نشونما حاصل کی اور وہ علی گڑھ کالج کی سوسائٹیوں اور کانفرنس کے جلسوں میں تقریریں کرنے لگے۔اس کے بعد ندوۃ العلماء قائم ہوا تو اس کے جلسوں میں بھی ان کی تقریروں نے خاص طور پر اہمیت حاصل کی اور وہ ہندوستان کے بے مثل اور بے نظیر خطیب اور مقرر تسلیم کئے جانے لگے۔''(۱)

اسی طرح کا ایک خطبہ انہوں نے دہلی میں بھی دیا تھا۔مولانا عبدالسلام ندوی نے جو ''خطبات شبلی'' یکجا کئے ہیں، اس میں یہ خطبہ شامل نہیں ہے۔ ۲۰۱۸ء میں راقم نے علامہ شبلی کی نادر تحریروں کا مجموعہ ''نوادرات شبلی'' شائع کیا تو اس میں سات نو دریافت خطبے شامل کئے تھے۔ یہ

آٹھواں نودریافت خطبہ ہے۔ پندرہ برس پہلے راقم نے علامہ شبلی کی نادر و نایاب اور منتشر تحریروں کی شیرازہ بندی کے جس منصوبے کا آغاز کیا تھا اور جو کئی جلدوں پر محیط ہوا۔ تعجب ہے وہ سلسلہ ابتک جاری ہے۔ زیرنظر خطبہ کی دریافت اس سلسلہ کی تازہ مثال ہے۔

علامہ شبلی نعمانی ۱۷ستمبر ۱۹۰۹ء کو دہلی پہنچے۔(۲) اور اپنے دوست خواجہ حسن نظامی [۱۸۷۶-۱۹۵۵ء] کی خواہش پر ان کے یہاں قیام کیا۔ یہ قیام نواب غلام نصیرالدین عرف نواب بڈھن میاں رئیس شیخو پورہ کی محل سرا واقع چتلی قبر دہلی میں تھا۔ یہ محل سرا اس وقت خواجہ صاحب کے تصرف میں تھی۔ ماہنامہ نظام المشائخ کا دفتر بھی اسی میں تھا۔ یہاں علامہ شبلی کا قیام ایک ماہ رہا۔ وہ اپنا باورچی ساتھ لے کر آئے تھے۔ سالن خود بناتے بقیہ کام باورچی نپٹاتا۔ اس مدت میں انہوں نے سوائے لالہ چندو لال چانول والے کے جو دہلی کے ایک رئیس اور شاعر تھے کسی کی دعوت قبول نہیں کی۔ اور یہ دعوت بھی انہوں نے خواجہ صاحب کی خواہش پر قبول کی تھی۔(۳)

اس قیام دہلی میں بقول علامہ شبلی دو رین لکچر ہوئے۔(۴) مگر ان کے اس سفر کے واقعہ نگاروں نے ان کی دو تقریروں کا ذکر کیا ہے۔ ایک تقریر انہوں نے جامع مسجد میں حوض کے پاس چاندنی رات میں کی تھی اور دوسری تقریر کا اہتمام خواجہ حسن نظامی نے اسی نواب بڈھن میاں کی محل سرا میں کیا تھا۔ حالانکہ اس زمانہ میں خواجہ صاحب کی اہلیہ سخت علیل تھیں اور پھر اسی علالت میں انتقال بھی کر گئیں، لیکن خواجہ صاحب کے معمولات میں کوئی فرق واقع نہیں ہوا۔(۵) علامہ شبلی نے ان سے کہا کہ

> ''خواجہ صاحب میری بیوی کا جب انتقال ہوا تھا میں پاگل سا ہو گیا تھا، لیکن آپ ہیں کہ برابر اپنے مشاغل میں مصروف ہیں، گویا کچھ ہوا ہی نہیں۔ آپ واقعی بہت مضبوط طبیعت کے انسان ہیں۔''(۶)

اسی حال میں خواجہ صاحب نے عمائدین دہلی کو مدعو کیا اور تعجب ہوتا ہے کہ تصوف جیسا خشک موضوع ہونے کے باوجود تقریباً دو ہزار افراد اس جلسے میں شریک ہوئے۔ اس کی تفصیل خود خواجہ صاحب نے نظام المشائخ میں لکھی ہے۔ انہی کے قلم سے ملاحظہ ہو:

> ''مرحومہ کی نازک علالت کے زمانہ میں شمس العلماء علامہ شبلی نعمانی دہلی تشریف

لائے اور باوجود تمام عمائدین دہلی کے اصرار کے انہوں نے میری عرض قبول فرمائی اور حلقہ کی منزل گاہ میں قیام فرمایا۔ اراکین وخدام حلقہ نے خواہش کی کہ اگر چہ مولانا کے علمی کارناموں کا تمام اسلامی دنیا میں غلغلہ ہے اور مشائخ تصوف کے حالات سے بھی مولانا نے دلچسپی ظاہر فرمائی ہے، جس کا ثبوت سوانح مولانا روم ہے، مگر آج تک مولانا کی زبان سے تصوف کی حقیقت کے بارہ میں کچھ نہیں سنا۔ کیا اچھا ہو کہ حلقہ میں مولانا کا ایک بیان تصوف پر ہوجائے۔ مولانا نے اس خواہش کو قبول فرمایا، مگر ساتھ ہی ازراہ انکسار اس کوچہ سے نابلد ہونے کا عذر کیا۔ القصہ اس روحانی جلسہ کا عام طور سے اشتہار تقسیم کیا گیا۔ اور دو ہزار کے قریب عمائدین وعوام ہندو مسلمانوں کا مجمع منزل گاہ حلقہ میں ہوگیا۔ جامع مسجد کے امام صاحب صدر بنائے گئے۔ شفاء الملک حکیم رضی الدین احمد خاں صاحب کی طرف سے حاضرین کو مولانا کی تعریف سنائی گئی۔ اور جناب قاری سرفراز حسین صاحب چشتی نظامی سیاح جاپان نے اول اغراض حلقہ کے متعلق نہایت مشرح ومدلل تقریر کی۔ اس کے بعد کامل دو گھنٹہ مولانا شبلی نے اپنا عارفانہ لکچر دیا۔ یہ بیان علاحدہ چھاپا جارہا ہے۔ مولانا نے تصوف کو تین حصوں میں تقسیم کرکے دکھایا۔ اول فلسفہ، دوم اخلاق، سوم حال۔ ان تینوں کی تشریح میں اس قدر واقفیت اور معلومات ظاہر کی کہ لوگ حیرت زدہ ہوگئے۔ وحدت وجود کو وحدت شہود پر ترجیح دینے میں کمال دکھا دیا۔ الغرض بیان ہمہ وجوہ مکمل اور پسندیدہ تھا اور بقول مولانا شبلی یہ پہلا دن تھا جو انہوں نے تصوف کے متعلق تقریر کی۔'' (۷)

ملا واحدی نے اپنی کتاب ''تاثرات'' میں لکھا ہے کہ علامہ شبلی کے دہلی آنے کا سنہ ۱۹۰۸ء ہے۔ (۸) اس تسامح اور ماہ نامہ نظام المشائخ کی کمیابی کی وجہ سے ہم کو اس خطبہ کو حاصل کرنے میں سالوں لگ گئے۔ یہ خطبہ نظام المشائخ دہلی جنوری ۱۹۱۰ء مطابق ۱۳۲۷ھ میں شائع ہوا ہے۔ نائب مدیر سید محمد ارتضی معروف بہ ملا واحدی [۱۸۸۸-۱۹۷۶ء] نے اس پر ایک نوٹ لکھا ہے جو قارئین کی دلچسپی کے لئے یہاں نقل کیا جارہا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

''جب حلقہ میں تصوف کے مضمون پر مولانا شبلی نے تقریر کرنی منظور کر لی تو دہلی

میں اس کا اشتہار تقسیم کیا گیا۔ جس میں مولانا کے اس موضوع تقریر کو عارفانہ لکچر کے لفظ سے ظاہر کیا گیا تھا۔ مولانا نے تقریر کی تمہید میں اس لفظ کو بے جوڑ بتایا کہ عارفانہ کے ساتھ لکچر موزوں نہیں۔ جب مولانا بیان ختم کر چکے تو حضرت مدیر اعلیٰ مولانا خواجہ حسن نظامی نے تقریر پر اظہار رائے کرتے ہوئے مولانا کو چودہویں صدی کے شبلی سے یاد کیا۔ گویا عارفانہ لکچر کے لفظ کو اس لطیف طریقہ سے درست کر دیا، یعنی نام اور کلام کے اعتبار سے یہ بیان عارفانہ بیان تھا، مگر چودہویں صدی کے طرز ادا کے سبب اس کا موزوں نام لکچر ہی ہوسکتا تھا۔

ہم نے بھی اس تقریر کا عنوان عارفانہ لکچر مذکورہ وجہ سے رکھ دیا ہے۔ خدا تعالی وہ دن جلد لائے کہ ہمارے نامور اور مایہ ناز علامہ شبلی نعمانی اسم بامسمی شبلی وقت مانے جائیں اور قال کے ساتھ حال کا صیغہ بھی ان کے ارشاد میں پیدا ہو جائے۔ اس وقت عارفانہ لکچر کی بجائے عارفانہ خطبہ کے لفظ کو استعمال کرنا ضروری سمجھیں گے۔'' (۹)

یہاں یہ واضح کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ دو گھنٹے کا یہ طویل خطبہ مکمل نقل نہیں کیا جا سکا، جیسا کہ ملا واحدی نے اپنے تمہیدی نوٹ میں بھی لکھا ہے۔ (۱۰) جن تین اشخاص کو اس خطبہ کے نقل کرنے پر معمور کیا گیا تھا، اس میں ایک ضیاء الدین احمد برنی [۱۸۹۰-۱۹۶۹ء] بھی تھے۔ انہوں نے اپنی کتاب ''عظمت رفتہ'' علامہ شبلی کے اس خطبہ کی روداد لکھی ہے۔ (۱۱)

خطبہ

موضوع بحث آج یہ ہے کہ تصوف کیا چیز ہے اور اسلام سے اس کا تعلق کیا ہے۔؟ شریعت اور طریقت دو جداگانہ چیزیں ہیں یا ایک ہیں۔ ایک گروہ کا خیال ہے کہ موجودہ زمانہ کا تصوف قرن اول اور قرن ثانی کے بعد پیدا ہوا ہے، اس لئے اس کو اسلام سے علاحدہ سمجھنا چاہئے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ تصوف شریعت کا حصہ اور شاخ ہے۔ صرف نام کے باعث جداگانہ چیز سمجھی جاتی ہے۔ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی تلقین اجمالی اور مجموعی تھی۔ بعد میں شاخیں اس تعلیم کی

علاحدہ علاحدہ ہوگئیں۔اور وہ جداجداعلم ہوگئے۔محدث جامع الاقوال تھے جو مسائل متعلق عبادت تھے احکام فقہ ہوگئے۔اخلاق کے متعلق جواقوال تھے ان کا نام اخلاق ہوگیا۔ترکیب جمع سے ہرایک نے جداگانہ نام پائے۔ورنہ سب چیزیں اس وقت موجود تھیں، البتہ ایک سو چالیس برس کے بعد جمع اور قلم بند ہوئیں۔اس لحاظ سے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ان میں سے کوئی چیز موجود نہ تھی۔صرف مرتب بعد میں ہوئی ہیں۔مثلاً ڈاکٹری پورے علاج کو کہتے ہیں، خواہ اندرونی ہو یا خارجی۔اوراس کی ہرشاخ کولیا جائے تو جراحی جدافن ہےاور آنکھ کا علاج علاحدہ ہے۔اس طرح ایک شاخ بجائے خود ایک مستقل فن ہے، حالانکہ ایک ہی چیز ہے۔

قاضی ثناءاللہ پانی پتی صاحبؒ اپنے مکاتیب میں شریعت،طریقت اورحقیقت کی تعریف اس طرح کرتے ہیں کہ مرض کی تشخیص کا نام شریعت ہے، جو عبادت نماز وغیرہ فرائض کے احکام بتاوے گی۔یعنی ایک نسخہ لکھ دے گی۔اس نسخہ کو بوقت ضرورت استعمال کرنے اور برتنے کا نام طریقت ہے۔اوراچھا ہوجانا،شفا پاجانا حقیقت ہے۔مولانا روم نے یہ تشبیہہ دی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خداشناسی کیونکر پیدا ہوتی ہے۔آگ کو دور سے دیکھ کر یا اس کی گرمی محسوس کرکے یہ معلوم ہونا کہ یہ آگ ہے شریعت ہے۔اورآگ کی لپٹ کے اندر ہاتھ ڈال کر متاثر ہونا طریقت ہے۔اوراس میں پڑکرخود آگ ہوجانا حقیقت ہے:

یتیمے کہ ناکردہ قرآں درست
کتب خانہ چند ملت بشست

تزکیہ نفس کا نام تصوف ہے۔روح کو کینہ ہوا وحرص غصہ سے آپس کی رنجش اور طمع وغیرہ امراض سے پاک کرنے کا نام طریقت ہے۔جس طرح جسمانی بیماریاں ہوتی ہیں اسی طرح روح کو بھی قسم قسم کے امراض لاحق ہوتے ہیں۔جسم کے طبیب ڈاکٹر حکیم ہیں اورروح کے معالج انبیاء اوراولیاء ہیں۔فرق صرف مادہ اورروح کا ہے۔درخت میں تازگی اور بالیدگی کی قوت ہوتی ہے۔جس کے بغیر وہ بیکار ہے۔نہ بڑھ سکتا ہے، نہ پتہ اور شاخیں قائم رہ سکتی ہیں۔اسی قوت کا نام روح ہے۔نماز ہم بھی پڑھتے ہیں، مگر ہماری نماز اور عارف کی نماز میں بہت فرق ہے۔گو دیکھنے میں وہ

ہماری طرح رکوع اور سجود کرتا ہے مگر باطن میں نماز اس کی کچھ اور ہی چیز ہے۔ آیت اور تلاوت تو وہ ہماری ہی طرح کرتا ہے مگر وہ عن الفحشاء والمنکر کا پورا عامل ہوتا ہے۔ وہ شریعت سے ایک اندرونی جدا طریقہ ہے۔ شریعت بیرونی محافظ ہے۔ اور آپ نے سنا ہوگا:

محتسب را دردن خانہ چہ کار

ماہ رمضان المبارک میں بعض اسلامی ممالک کے اندر شراب سر بازار فروخت نہیں ہوسکتی۔ اگر ایسا ہو تو محتسب پکڑ لے۔ مگر کوئی گھر کے اندر بیچے تو اس پر محتسب کیا زور چل سکتا ہے۔ ایک مرتبہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ شب کو گشت لگا رہے تھے۔ ایک مکان سے گانے کی آواز آئی۔ آپ نے سمجھ لیا کہ یہاں منہیات شرعی ہو رہی ہیں۔ اس خیال سے آپ مکان کی پشت کی جانب سے جا کر مانع ہوئے۔ مکان دار نے کہا کہ حضرت اگر مجھ سے ایک گناہ ہوا ہے تو آپ سے دو گناہ سرزد ہوئے۔ اول یہ کہ مکان کے باہر کے دروازہ سے آنے کا حکم ہے اور آپ نے اس کی خلاف ورزی کی ہے۔ آپ خاموش واپس چلے گئے۔ یہ معنی شریعت ظاہری کے ہیں۔ اور ان احکام کا پابند ہونا تصوف ہے:

ما بروں را ننگریم وقال را
ما دروں را بنگریم وحال را

صحابہ کرامؓ مختلف طور سے تلقین پاتے تھے۔ استعداد کے موافق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کو تعلیم دیتے تھے۔ صحابہؓ کی جیسی حالتیں مختلف تھیں ویسی ہی جداگانہ ان کی تعلیم تھی۔ مثلاً خالد بن ولیدؓ سپہ سالار۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے چھ ہزار حدیث جمع کی۔ اصحاب صفہ اسی (۸۰) تھے، جن کا کام یہ تھا کہ ہاتھ پاؤں توڑ کر مسجد کے چبوترہ پر بیٹھ رہیں اور شب و روز عبادت میں گذار دیں۔ ان کی خوراک صرف یہ تھی کہ مال دار صحابہ کھجور کے خوشے لا کر محراب مسجد میں لٹکا دیتے تھے جن سے کھجوریں ایک ایک دو دو ٹپکتی تھیں اور وہ اصحاب صفہ میں سے جس کے حصہ میں آجائیں اسی کی خوراک ہوتیں اور جن کو کھجوریں نہ ملتیں اور بھوک کی شدت ہوتی وہ پیٹ سے پتھر باندھ لیتے تھے۔ ایک صحابی کو جب کئی روز متواتر فاقے ہوئے اور پتھر باندھنے پر بھی ان کی سیری نہ ہوئی تو انہوں نے تلاش خوراک کی اس طرح شروع کی کہ اس زمانہ میں قاعدہ تھا کہ جب کوئی مسئلہ

دریافت کرتا تو جو شخص اس مسئلہ کو بتاتا دریافت کرنے والے کو کھانا بھی اپنے پاس سے کھلاتا۔ چنانچہ جب وہ صحابی چلے تو سب سے پہلے حضرت ابوبکر صدیق نظر پڑے۔ان سے مسئلہ دریافت کیا مگر ان کے پاس کچھ موجود نہ تھا جو ان کو کھانے کو دیتے ،اس لئے وہ طرح دے کر آگے بڑھ گئے۔ پھر حضرت فاروق آ رہے تھے،ان سے اس صحابی نے مسئلہ دریافت کیا۔ وہاں بھی کچھ نہ تھا، اس لئے وہ بھی آگے بڑھ گئے۔ان کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لا رہے تھے۔ جب ان سے مسئلہ دریافت کیا تو انہوں نے حال پوچھا۔ گھر لے گئے اور تھوڑا دودھ پلایا۔

غرض جس صحابی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جو مادہ زیادہ پاتے تھے اسی کے موافق تعلیم دیتے تھے۔غبی ذہین ہر قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ان کو ایک پیمانہ پر لانا نبوت کی کمی اور نقص کا باعث ہے۔اور خدا تعالی خاتم النبیین کی شان میں فرماتا ہے، **اکملت لکم دینکم**. آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ میری مثال اس دیوار کی ہے جو تعمیر ہو کر تیار ہو گئی ہے۔ صرف ایک اینٹ کی جگہ اس میں خالی ہے۔

ہمہ رنگی آفتاب ماہتاب چراغ ستارے سب چیزیں جدا جدا صورت میں بھلی معلوم ہوتی ہیں۔حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تلقین امیر غریب کے لئے یکساں تھی۔ وہ سب کو تارک الدنیا بنانا چاہتے تھے۔ آپ کا قول تھا کہ دولت مند بہشت میں داخل نہیں ہوں گے۔ تحقیق یہ تھی صلاحیت جس نیکی کی جس شخص میں دیکھی اسی کی طرف اس کو بڑھایا اور درجہ تکمیل کو پہنچایا۔امیر معاویہ کو بے نظیر ملکی مدبر بنا دیا۔ فقر کا حصہ حضرت ابوبکرؓ یا حضرت علیؓ پر ختم ہے اور یہ سلسلہ انہیں دونوں حضرات پر منتہی ہوتا ہے۔ایک مرتبہ جنگ میں حضرت علیؓ کے جسم کے اندر ایک تیر ایسا پیوستہ ہوا کہ وہ کسی طرح نہ نکل سکا۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ جس وقت ہم نماز میں مشغول ہوں اس وقت یہ تیر نکال لیا جائے۔ چنانچہ جس وقت آپ نماز کے لئے کھڑے ہوئے تیر نکالا گیا۔ گوشت میں ٹانکے لگے۔ زخم کی مرہم پٹی ہوئی، مگر آپ کو مطلق خبر نہ ہوئی۔ یہ ہے عارفوں کی نماز اور حقیقی نماز۔اس لحاظ سے ابو ہاشم صوفی اول تھے۔ مسئلہ وحدۃ الوجود کا پرتو اور حقیقی وجود کی مثال درخت کے سایہ کی ہے کہ سایہ بھی مثل درخت کے ہے اور متحرک بھی ہوتا ہے۔ مگر درخت سے بالکل علاحدہ چیز ہے اور دیکھا جائے تو کچھ بھی نہیں، اسی کے وجود کا پرتو ہے۔اسی طرح یہ عالم اسی وجود کا پرتو ہیں۔اور یہ

تمام صورتیں اسی ایک ذات کے نتائج ہیں۔ جس طرح چراغ کی روشنی ہم تنہائی میں محسوس کرتے ہیں مگر آفتاب کی روشنی میں اگر چراغ جلایا جائے تو ہم کو چراغ کی روشنی بالکل دکھائی نہ دے گی۔ حالانکہ موجود ہوگی۔ اسی طرح ہم ممکنات ہیں اور خدا کے وجود کے سامنے دکھائی نہیں دیتے۔ یہ شہود کی دلیل ہے۔ مگر جو یہ کہتے ہیں کہ ہم وہی ہیں، دراصل ایک ہی وجود ہے جو سب جگہ موجود ہے۔ بات یہ ہے کہ سب خدا تعالیٰ ہی کے مظاہر ہیں:

باوحدت حق بہ کثرت خلق چہ پاک
گر صد جائے گرہ زنی رشتہ یک است

بجز دھاگے کے کچھ نہیں ہے۔ گرہ بذات خود کوئی وجود نہیں رکھتی۔ گو اس کا نام بالکل علاحدہ ہے۔ یہ خدا کے وجود کا فلسفہ سے ثبوت ہوا۔

قرآن شریف میں ایسے الفاظ موجود ہیں جن سے یہ بزرگ استدلال کرتے اور حجت لاتے ہیں۔ قرآن شریف کا کلام ایسا پر معنی ہے کہ ہر شخص اس سے جداگانہ مطلب سمجھتا ہے۔ مثلاً مسح کی نسبت ایک امام فرماتے ہیں کہ سارے سر کا مسح کرنا چاہئے۔ دوسرے ارشاد کرتے ہیں کہ نصف سر کا لازمی ہے۔ تیسرے ایک بال کا تر ہو جانا کافی خیال کرتے ہیں۔ حالانکہ الفاظ ایک ہی ہیں، مگر تین جداگانہ طور پر مسئلے اس سے سمجھے جاتے ہیں۔ مجتہد کو ہر مسئلہ کی ایجاد پر دس ثواب ہوتے ہیں اور وہ غلطی بھی کرے تب بھی ایک ثواب کا وہ ضرور مستحق ہوتا ہے۔

ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حالت سفر میں چند صحابیوںؓ سے ارشاد فرمایا کہ نماز عصر کی ہمارے ساتھ پڑھنا۔ اتفاق ایسا ہوا کہ نماز عصر کا وقت تنگ ہونے لگا تو بعض کی ان میں سے یہ رائے ہوئی کہ نماز پڑھ لینی چاہئے، کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ مطلب تھا کہ ہمارے پاس پہنچ جاؤ تو ہمارے ساتھ پڑھنا۔ اور بعض نے ان میں سے یہ خیال کیا کہ نہیں حضورؐ کا یہ فرمان تھا کہ نماز ہمارے ہی ساتھ پڑھنا چاہے کتنا وقت تنگ رہ جائے۔ چنانچہ بعض نے نماز ادا کی۔ بعض نے قضا کی۔ اور منزل پر پہنچ کر دونوں فریق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں پیش ہوئے اور اپنا اپنا حال عرض کیا۔ حضور نے دونوں کو معاف کر دیا۔ اس وجہ سے کہ وہ الفاظ ہی ایسے تھے جن سے دونوں نے اپنی اپنی سمجھ کے موافق مطلب سمجھا تھا۔ اسی طرح قرآن شریف کا

کلام پاک ہے۔اس میں سب کچھ ہے،مگر سمجھنے والا چاہئے۔**ھو الاول ھو الآخر ھو الظاھر ھو الباطن** سے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ ظاہر اور باطن میں وہی ہے۔اور اسی سے ان بزرگوں کا یہ مسئلہ ثابت ہو جاتا ہے۔ہاں جو لوگ یہ کہیں کہ میں خدا ہوں وہ پکے موحد نہیں۔اسی لئے منصور کو سزا دی گئی۔سولی پر چڑھایا گیا۔کیونکہ اس نے میں ! اپنے کو خدا سے جدا ٹھہرایا۔اگر وہ یہ کہتا کہ خدا ہی خدا ہے تو ٹھیک تھا۔اس نے پہلے میں کہا جس سے سمجھا گیا کہ خدا کی ذات سے میں کوئی علاحدہ چیز ہے۔یہ وحدت نہ رہی۔

تصوف کا اثر اخلاق پر اور جذبات پر پڑتا ہے۔جس سے عالم گیر صبر و رضا پھیلتی ہے۔ وحدۃ الوجود کا مسئلہ کفر بد باطنی کے خبائث کو دل سے مٹاتا ہے:

کفراست در طریقت ماکینہ داشتن
آئین مااست سینہ چو آئینہ داشتن

زیں عشق بہ کونین صلح کردم
تو خصم باش ورنا دوستی تماشا کن

ایک صوفی صاحب کا یہ قول تھا کہ سورج میرے حکم پر طلوع و غروب ہوتا ہے۔آسمان و زمین میرے اشارہ پر حرکت کرتے ہیں۔نظام عالم میرے ہی واسطے قائم ہے۔اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ اس نے اپنی ہستی کو محو کر دیا تھا اور فنا فی اللہ کے درجہ تک پہنچ گیا تھا۔یا یوں کہئے کہ جو کچھ تقدیر الٰہی میں ہوتا اس کو وہ اپنی مرضی کے موافق سمجھ کر راضی ہو جاتا۔سچ تو یہ ہے کہ رضینا بالقضا کا مسئلہ بغیر توحید وجودی کے پیدا نہیں ہوتا:

روئے تو بہر دیدہ کہ بینند نکوست　　　نامے تو بہر زباں کہ گویند نکوست
دل جز غم عشق نہ جوید ہرگز　　　یا جز درہ تو نہ ہوید ہرگز
صحرائے دلم عشق تو شورستاں کرد　　　تا مہر کسے جز تو نہ روید ہرگز

ایک صوفی کو شیخ الاسلام ہرات نے کافر کہا تو صوفی نے اپنے ہی نفس کو ملامت کی کہ میں تجھ کو پچاس سال سے کہتا تھا کہ اے نفس تو کافر ہے مگر تجھ کو یقین نہ آتا تھا۔اب شیخ الاسلام کی

زبان سے سن کرتو تجھ کو یقین آیا کہ تو کافر ہے۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیر شریف میں جس وقت تشریف لائے ہیں تو ان کے قلب کی تلوار اور روحانی اثر سے صدہا مسلمان ہو گئے۔ان کے پاس سوائے روحانی اثر کے اور کیا تھا۔؟

عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی شام پر چڑھائی تھی۔یادگار زمانہ ہے کہ وہ زبانی تصفیہ کی درخواست پر مدینہ سے ایک اونٹ اور ایک غلام لے کر روانہ ہوئے۔غلام سے یہ قرار پایا کہ تین تین کوس کی باری رہی۔پہلے ہم تین کوس اونٹ پر سوار ہوں پھر تم سوار ہونا۔اور اسی طرح یہ سفر طے کیا جائے گا۔چنانچہ جب سفر ختم کے قریب پہنچا تو غلام کی باری سواری کی تھی۔غلام نے عرض کیا کہ شان وشوکت دکھانے کا موقع آ گیا۔اب آپ سوار ہو لیجئے۔میں اونٹ پر سے اتر جاتا ہوں۔مگر آپ نے نہ مانا اور خلاف باری اونٹ پر سوار ہونا منظور نہ کیا۔اس حالت نے ایسا اثر ڈالا کہ ہزاروں کفار مسلمان ہو گئے۔بات یہ ہے کہ ہر چہ از دل خیزد بدل نشیند:

ترا کے میسر شود ایں مقام

کہ بادوستانت خلاف است جنگ

عقائد کے بعد علم کا درجہ ہے۔علم کو صوفیائے کرام دو قسم کا بتاتے ہیں۔ان کا مقصد علم ظاہری نہیں جو حواس کے ذریعہ معلوم ہو سکے۔بلکہ دل کو صاف کرنا اور اور توجہ کرنا۔انکشاف قلب ہو کر ہر شی کا علم ہوتا ہے۔قدر ایں بادہ ندانی بخدا تا نہ چشی۔

امام غزالیؒ نے بعد عرصہ بسیار کے یہ درجہ حاصل کیا تھا۔جب ایک گنبد میں جا کر گوشہ نشیں ہوئے تھے۔اس وقت فرمایا تھا:

فکان ماکان ممالست الذکری

فظن خیراً ولا تسئلہ ضمیری

جب ایسے عالم یہاں آ کر قائل ہو جاتے ہیں تو ہم کس شمار میں ہیں۔علم کے بعد اخلاق ہے۔نفس کشی،تواضع،انکسار اور اخلاص خاص ہے۔جس کے معنی ہیں اکہرا کر دینا۔جو مسلمانوں میں آج کل مفقود ہے۔یعنی جو کام کرتے ہیں اس میں ان کی ظاہری نیت اور ہوتی ہے اور باطن میں مقصود کچھ اور ہوتا ہے۔

اگر مدرسہ قائم کر کے فیض پہنچانا چاہیں گے تو اس میں اپنے کسی عزیز کو ملازم کرانا اور خود مولوی صاحب کہلانے کا منشاء ضرور ہوگا۔ یہ نفس کی چوریاں ہیں جن کو اگلے لوگ نہیں جانتے تھے۔ مگر ہم دیدہ و دانستہ ان خبائث سے باوجود آگاہ ہونے کے ان کو کرتے ہیں۔

ایک مولوی صاحب نے ایک شہر میں وعظ کہا۔ دوسرے واعظ نے زیادہ اثر ڈالا۔ پہلا واعظ اس نے بجائے خوش ہونے کے حسد کرنے لگا۔ یہ اخلاص ہرگز نہیں کہا جا سکتا۔

خدا غیرت مند ہے۔ وہ دوسرے کو چاہتا نہیں دیکھ سکتا۔ یہی حال اس کے علم کا ہے۔

شرکت غم بھی نہیں چاہتی غیرت میری
غیر کی ہو کے رہے یا شب فرقت میری

شبلی نعمانی (۱۲)

خودی سے بےخودی میں آ جو جوش حق پرستی ہے
جسے تو نیستی سمجھا ہے اے غافل! وہ ہستی ہے

کیا جانے کسے دیکھ رہا ہوں میں بتوں میں
آنکھوں میں ہے کچھ دل میں بسا اور ہی کچھ ہے

دل میں تم، آنکھ میں تم، کعبہ میں تم، دیر میں تم
تم جہاں چاہو چھپو، ہم تمہیں پہچان گئے ہیں

خورشید بھی اس نور کا مظہر ہے قمر بھی
اے بے بصر و کچھ تمہیں آتا ہے نظر میں

دوسرا کون ہے جہاں تو ہے — کون جانے تجھے کہاں تو ہے
لاکھ پردوں میں ہے تو بے پردہ — سو نشانوں پہ بے نشاں تو ہے
تو ہی خلوت میں تو ہی جلوت میں — کہیں پنہاں کہیں عیاں تو ہے

نہیں تیرے سوا جہاں کوئی　　میزباں تو ہے میہماں تو ہے
جسم کہتا ہے جان ہے تو ہی　　جان کہتی ہے جان جاں تو ہے

امیر مینائی(۱۲)

حوالے

(۱) خطبات شبلی ص ۵

(۲) باقیات شبلی ص ۱۳۸

(۳) ایضاً

(۴) ضیاءالدین احمد برنی، عظمت رفتہ ص ۲۶۶-۲۶۷۔ ادارہ علم وفن کراچی، ۲۰۰۰ء

(۵) ایضاً ص ۲۶۶

(۶) ایضاً

(۷) ماہنامہ نظام المشائخ دہلی، رمضان المبارک ۱۳۲۷ء، ص ۶۱-۶۲

(۸) ملا واحدی، تاثرات، ص ۴۶۔ مرتبہ حکیم محمد سعید، ہمدرد اکیڈمی کراچی، ۱۹۷۰ء

(۹) ماہنامہ نظام المشائخ دہلی، ذی الحجہ ۱۳۲۷ء، مطابق جنوری ۱۹۱۰ء، ص ۲

(۱۰) ایضاً ص ۱

(۱۱) عظمت رفتہ ص ۲۶۶-۲۷۵

(۱۲) علامہ شبلی کا یہ شعر اور کہیں نہیں ملتا۔ گویا یہ ان کے کلام میں ایک اضافہ ہے۔

(۱۳) ماہنامہ نظام المشائخ دہلی، جنوری ۱۹۱۰ء ص ۱-۱۰

(مطبوعہ: ماہ نامہ معارف اعظم گڑھ، جولائی ۲۰۲۰ء)

[۲]

علامہ شبلی کے نام معاصرین کے خطوط

مسائل ومباحث

علامہ شبلی نعمانی کے نادر خطوط کے مجموعہ ''مکتوبات شبلی'' کی اشاعت کے بعد ان کے نام آئے اہل علم کے خطوط کی تلاش وجستجو کا آغاز ہوا۔ اور ایک سال بعد ۲۰۱۳ء میں ۵۳؍خطوط کا ایک مجموعہ ''علامہ شبلی کے نام اہل علم کے خطوط'' تعلیقات وحواشی کے ساتھ ادبی دائرہ اعظم گڑھ کی طرف سے شائع کیا گیا۔ جسے اہل ذوق بالخصوص قدر دانان شبلی نے شوق کی نظروں سے دیکھا۔ مکتبہ جمال لاہور نے بھی اسے شائع کیا۔ اس دوران دوسرے دوسرے کام شروع ہوئے اور پایۂ تکمیل کو پہنچے۔ تاہم ان خطوط پر نگاہ تلاش رہی اور اب پانچ سال بعد ۵۵؍خطوط یا خطوط کے اہم اقتباسات اور دستیاب ہوگئے ہیں۔ زیر نظر مقالہ انھیں کے تعارف وتجزیے پر مشتمل ہے۔ واضح رہے کہ اس میں ''علامہ شبلی کے نام اہل علم کے خطوط'' میں شامل مکاتیب سے تعارض نہیں کیا گیا ہے۔ ان کا مطالعہ وتجزیہ کسی اور موقع کے لئے اٹھا رکھا گیا ہے۔

نودریافت خطوط میں علامہ شبلی کی فکر ونظر کے علاوہ ان کے بعض اہم کارنامے مثلاً انجمن ترقی اردو، وقف علی الاولاد، ندوۃ العلماء، ان کی کتاب ''الانتقاد'' اور بعض دوسرے ضمنی موضوعات زیر بحث آئے ہیں اور یہ خطوط اس لحاظ سے بے حد اہم ہیں کہ ان کا علی العموم قدر دانان شبلی کو علم نہ تھا اور یہ بھی بڑی اہم بات ہے کہ شبلی کے مکتوب نگاروں میں ملک وملت کے مقتدر مشاہیر شامل ہیں، جنھوں نے علامہ شبلی کی آواز پر لبیک کہا اور ان کی تحریکات اور علمی، ادبی، ملی اور سماجی خدمات میں حصہ لیا۔ چنانچہ مولانا الطاف حسین حالی، نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی، مولانا محمد علی مونگیری، سر سید امام علی، نصیر حسین خیال، مسٹر مظہر الحق، حکیم محمد اجمل خاں، شیخ رشید رضا مصری،

ڈاکٹر محمود لبیب وغیرہ کے ناموں سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ خطوط کس درجہ اہمیت کے حامل ہوں گے اور ہماری ملی زندگی سے ان کا کس قدر گہرا تعلق ہوگا۔

ا۔ انجمن ترقی اردو

۴/جنوری ۱۹۰۳ء کو انجمن ترقی اردو کا قیام عمل میں آیا (باقیات شبلی ص ۶۵) اور علامہ شبلی اس کے پہلے سکریٹری مقرر ہوئے اور انتہائی دلچسپی اور دل سوزی کے ساتھ انھوں نے ترقی اردو کے کاموں کا آغاز کیا۔ انھوں نے متعدد علمی وادبی منصوبے بنائے۔ اہم علمی موضوعات پر تصنیفات وتالیفات کے لئے اشتہارات شائع کئے۔ چنانچہ اس میں حصہ لینے کے لئے متعدد اہل علم وقلم نے علامہ شبلی سے خط وکتابت کی۔ اس میں جن اشخاص کے نام معلوم ہو سکے وہ یہ ہیں:

ا۔ نارائن پرشاد ورما، ۲۔ ڈپٹی نذیر احمد دہلوی، ۳۔ مولوی شیخ محمد بانسواڑہ، ۴۔ مولوی واحد حسین، ۵۔ سید محمد رئیس الزماں، ۶۔ مولانا ابوالکلام آزاد، ۷۔ مولوی عبدالوہاب زبیری، ۸۔ مولوی سید محمود، ۹۔ حافظ سعید احمد، ۱۰۔ مولوی کریم احمد بدایونی، ۱۱۔ قاضی علی احمد، ۱۲۔ مولوی حشمت علی ہانسی، ۱۳۔ مولوی عبدالواحد بچھراؤں، ۱۴۔ مولوی شرف الدین رام پور، ۱۵۔ مولوی شان الٰہی اٹاوہ، ۱۶۔ فقیر سید افتخار الدین راول پنڈی، ۱۷۔ مولوی سید مرتضیٰ رام پور، ۱۸۔ مولوی سید مسعود احمد فتح گڑھ، ۱۹۔ قاضی عبداللطیف کلکتہ، ۲۰۔ مولوی ولی الحق، سنڈ اضلع پٹنہ، ۲۱۔ خواجہ غلام الحسنین حیدرآباد، ۲۲۔ مولوی محمد یوسف، کلکتہ، ۲۳۔ مولوی ریاض حسن خاں خیال رئیس رسول پور، ۲۴۔ خواجہ حسن نظامی دہلی، ۲۵۔ مولوی امجد علی اشہری، ۲۶۔ مولوی عزیز مرزا، ۲۷۔ مولوی ظفر عمر۔

یہ ان اہل علم اور ارباب کمال کے نام ہیں جنھوں نے محض تصنیف وتالیف وترجمہ سے متعلق خط وکتابت کی تھی۔ ورنہ انجمن ترقی اردو کے دیگر امور سے متعلق رابطہ اور خط وکتابت کرنے والوں کی فہرست خاصی طویل ہے۔ ابتدا ہی میں علامہ شبلی نے مختلف علاقوں کے اہل علم کو خطوط لکھنے کا اہتمام شروع کرا دیا تھا اور مئی ۱۹۰۳ء تک خود انھوں نے اور جوائنٹ سکریٹری مولوی حامد صدیقی نے سوا سو سے زاید خطوط لکھے تھے اور اس پر بڑا وقت صرف کیا۔ ان کے جوابات بھی دفتر میں محفوظ رکھے گئے تھے۔ افسوس کہ وہ سب ضائع ہو گئے اور اس سلسلہ کا کوئی مکمل خط علامہ شبلی

کے نام دستیاب نہیں ہوا۔ محض چند خطوط کے اقتباسات خود علامہ شبلی کی تحریروں میں ملے ہیں۔

۱۔ مولوی سید مسعود احمد فتح گڑھ کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے علامہ شبلی کو لکھا کہ

''میں عربی وفارسی کتب کا ترجمہ کرنا چاہتا ہوں اور قوم سے اجرت یعنی انعام کا خواہاں نہیں ہوں۔''(۱)

مولوی سید مسعود احمد کے بارے میں اس سے زیادہ کہ وہ فتح گڑھ کے رہنے والے تھے معلومات دستیاب نہ ہوسکیں اور یہ بھی معلوم نہ ہوسکا کہ آیا انھوں نے انجمن کے لئے کسی کتاب کا ترجمہ کیا یا نہیں۔؟

۲۔ قاضی عبداللطیف صاحب کلکتہ کے باشندہ اور بڑے مترجم تھے۔ کلکتہ ہائی کورٹ نے انھیں ترجمہ کرنے کی سند عطا کی تھی۔ باوجود تلاش بسیار کے ان کے کسی کتاب کے ترجمہ کا علم نہیں ہوسکا۔ انھیں سائنس سے خصوصی دلچسپی تھی اور سائنسی کتب کا ترجمہ انجمن ترقی اردو کے لئے کرنے کے خواہاں تھے۔ انھوں نے علامہ شبلی کو لکھا کہ:

''میں اگرچہ متمول نہیں ہوں ڈلیکن فیاض دل واقع ہوا ہوں۔ آپ مجھ سے بلا اجرت سائنس کی کتابوں کا ترجمہ کرا سکتے ہیں اور میں نہایت خوشی سے اپنی خدمات کو آپ کی انجمن میں وقف کرتا ہوں۔''(۲)

قاضی عبداللطیف حبل المتین کلکتہ کے ایڈیٹوریل اسٹاف میں ملازم تھے۔ ان کے حالات اور خدمات کی تفصیل بھی دستیاب نہ ہوسکی۔

۳۔ ڈپٹی نذیر احمد دہلوی [۱۸۳۶۔۱۹۱۲ء] کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ وہ علامہ شبلی سے عمر میں ۲۱؍سال بڑے تھے اور ان پر خاص شفقت فرماتے تھے۔ اور وہ انجمن کے نائب صدر بھی تھے۔ علامہ شبلی کی ترجمہ کی مہم سے متاثر ہوکر انھیں لکھا کہ

''مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ کی جماعت میرے حق میں گمان نیک رکھتی ہے اور اسی وجہ سے آپ نے مہربانی فرما کر مجھ کو کانفرنس کی شاخ (انجمن) ترقی اردو کا وائس پریسیڈنٹ بنا دیا ہے، جس امتیاز کا اہل میں اپنے تئیں نہیں سمجھتا، مگر میں اس مہربانی کی جہد المقل تلافی کرنا چاہتا ہوں کہ ترقی اردو میں کچھ مدد دوں، یعنی .... کا ترجمہ

کر دوں گا، بلا معاوضہ۔'' (۳)

ڈپٹی نذیر احمد دہلوی ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں۔

''نقدی امداد جو آپ میری حالت کے مناسب سمجھیں بے تکلف اس سے مطلع فرمائیں۔ان شاءاللہ تعالی اس کے حاضر کرنے میں دریغ نہ ہوگا۔'' (۴)

گویا ڈپٹی نذیر احمد علمی مدد کے ساتھ مالی مدد کے لئے بھی تیار تھے۔انجمن کی تاریخ میں ان کے علمی اور مالی دونوں طرح کے تعاون کا ذکر ملتا ہے۔ان کا علمی تعاون یہ تھا کہ مترجمہ کتب کے معیاری یا غیر معیاری ہونے کے فیصلے کے لئے جو کمیٹی علامہ شبلی نے مقرر کی تھی اس میں وہ شامل تھے۔اورانھوں نے سو روپئے کا چیک دے کر انجمن کو مالی فائدہ بھی پہنچایا۔(۵)

۲۔علامہ شبلی انجمن ترقی اردو کی ترقی واستحکام کے لئے مسلسل کوشاں رہے۔ایک طرف تصنیف وتالیف اور تراجم کے لئے جد وجہد کر رہے تھے تو دوسری طرف ملک کے اہل علم اور اہل ثروت دونوں سے رابطہ کر کے انھیں انجمن کے اراکین میں شامل کر رہے تھے۔تیسرا کام مترجمین کو تراجم کے لئے حوصلہ افزائی کر رہے تھے۔اسی طرح اہل علم اور مصنفین کو موضوعات کی تعیین اور ان کے لئے مواد کی فراہمی میں بھی مدد دے رہے تھے۔گویا وہ ترقی اردو کے لئے جان کی بازی لگائے ہوئے تھے۔

اسی دوران بعض ہندو اہل قلم کی طرف سے اخبار ہندوستانی لکھنو میں یہ اعتراض شائع ہوا کہ انجمن میں ہندوؤں کو نظر انداز کیا گیا ہے۔چنانچہ علامہ شبلی نے فوراًاس کا یہ جواب اخبارات میں شائع کرایا کہ

> ''یہ واقعہ کے خلاف ہے۔انجمن کے قواعد میں اس خیال کا شائبہ بھی نہیں پایا جاتا اور عملی تردید اس خیال کی یہ ہے کہ انجمن نے سب سے پہلا انعام جو تصنیف پر دیا وہ ایک ہندو مترجم کو دیا اور ایک ایسی کتاب پر دیا جو ہندو قوم کے ساتھ مخصوص تھی،یعنی پیغمبران ہند (رہنمایان ہند) جس میں سری کرشن جی اور گوتم بدھ کا تذکرہ اور ہندو مذہب کے اصول اور عقائد ہیں۔'' (۶)

علامہ شبلی کے اس تردیدی بیان کی اشاعت کے بعد اردو کے متعدد ہندو اہل علم وادب

انجمن کے رکن بنے اور میرٹھ کے رئیس آنریبل رائے نہال چند نے علامہ شبلی کو لکھا کہ

''میرے خیال میں ضرورت اور سخت ضرورت ہے کہ اردو ہندی زبانوں کو ترقی دی جائے اور عمدہ کتب سے مالا مال کر کے اس درجہ پر پہنچایا جائے جس درجہ پر کہ بنگالی زبان پہنچی ہے۔ خداوند کریم جناب کی کوششوں میں کامیابی عطا فرمائے۔(۷)

رائے نہال چند نے علامہ شبلی سے انجمن کا دستور العمل منگایا اور پھر انجمن کی ممبری قبول کی۔(۸) اس طرح انجمن کا کارواں اتحاد و یگانگت کا کارواں بن کر آگے بڑھا۔ یہی نہیں ہندوؤں کے ساتھ بعض انگریز عہدہ داروں نے بھی رکنیت قبول کی۔(۹) جیسا کہ اس عہد کی فہرست اراکین سے معلوم ہوتا ہے۔ تفصیل کے لئے ''باقیات شبلی'' میں شامل انجمن ترقی اردو کی ابتدائی روداد یں جو علامہ شبلی کے قلم سے ہیں اور جو علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں شائع ہوئی ہیں، ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔

۲۔ اصطلاحات

علامہ شبلی نے تراجم کا منصوبہ بناتے ہی اصطلاحات کی طرف توجہ کی اور چند اصطلاحات پر مبنی ایک پمفلٹ تیار کرا کے مترجمین کے پاس ان کی سہولت کے لئے بھیجا تھا، مگر اس کی جس پیمانہ پر ضرورت تھی اس کی طرف اہل علم نے متوجہ کیا اور سب سے پہلے نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی نے حیدر آباد سے خط لکھا کہ

''علمی کتابوں کا ترجمہ اس وقت تک نہیں ہوسکتا، جس وقت تک مصطلحات کی وضع کا کوئی اصول قائم نہ ہو جائے۔ کمیٹی اپنا فرض منصبی یہ قرار دے کر کسی علمی لغت کی کتاب کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کر دے، یا اقل مرتبہ اس کی لغات کے واسطے مناسب ترجمہ تجویز کر دے۔''(۱۰)

نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی انگریزی کے ایک بڑے اہل قلم اور ادیب وشاعر تھے۔ علامہ شبلی نے اخیر دور میں اسی مہارت کی بناء پر ان سے انگریزی ترجمہ قرآن مجید کی خواہش کی تھی، جسے انھوں نے نہ صرف قبول کیا بلکہ ۱۶/ پاروں کا تک کا ترجمہ بھی کر دیا تھا۔ بقیہ پاروں کا

ترجمہ ان کی خرابی صحت وضعف کی وجہ سے پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔ حالانکہ وہ علامہ شبلی کی وفات کے بعد برسوں زندہ رہے۔ انہوں نے ۱۹۲۶ء میں وفات پائی۔

نواب سید حسین بلگرامی ترجمہ کے نشیب وفراز سے بخوبی واقف تھے، اسی لئے انھوں نے مصطلحات سے متعلق یہ اہم مشورہ دیا تھا۔ بعدازاں یہی مشورہ خواجہ الطاف حسین حالی [۱۸۳۷-۱۹۱۴ء] نے بھی علامہ شبلی کو ایک خط میں دیا اور لکھا کہ

> ''میری رائے یہ ہے کہ انجمن ترقی اردو پہلے اس سے کہ انگریزی سے اردو میں علمی کتابوں کے ترجمے کرائے، اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ ایک فرہنگ یا ڈکشنری علمی اصطلاحات کی انگریزی اور عربی قوانین کی مدد سے اردو میں مرتب کرائے۔'' (۱۱)

مولوی عزیز مرزا [۱۸۶۵-۱۹۱۲ء] نے بھی اس ضروری امر کی طرف علامہ شبلی کو متوجہ کیا اور اپنی خدمات پیش کیں۔ بعد میں انہوں نے اس موضوع پر ایک زبردست کتاب مرتب کی۔ جسے انجمن ترقی اردو نے مولوی عبدالحق [۱۸۷۰-۱۹۶۱ء] کے دور نظامت میں شائع کیا۔

علامہ شبلی نے انجمن کی طرف خاص توجہ کی، مگر اپنی دیگر مصروفیات اور ارکان ایجوکیشنل کانفرنس کے عدم التفات کے سبب غالباً دسمبر ۱۹۰۵ء میں انجمن سے مستعفی ہو گئے۔ البتہ انجمن کے بعد کے نظما نے اصطلاحات سے متعلق کتب پر خاطر خواہ توجہ دی اور متعدد معیاری کتابیں شائع ہوئیں۔ چونکہ بعد میں بابائے اردو مولوی عبدالحق انجمن کے سربراہ ہوئے اور اپنی مخاصمت کی وجہ سے انہوں نے علامہ شبلی کی ابتدائی کوششوں کا ذکر صراحت سے نہیں آنے دیا۔

۳۔ انجمن وقف علی الاولاد

عہد شبلی میں انگریز جج ناواقفیت کے سبب وقف اولاد کے سلسلہ میں غلط فیصلے صادر کر رہے تھے، جس سے مسلمانوں کی وقف جائدادیں ضائع ہو رہی تھیں۔ اس کے خلاف ۱۹۰۸ء میں علامہ شبلی نے تحریک وقف علی الاولاد کا آغاز کیا اور اپنی انتھک محنت اور جدوجہد سے اس تحریک کو ملک گیر بنا دیا۔ اس کی تفصیل حیات شبلی میں موجود ہے۔ ان کا اس سلسلہ کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ

انھوں نے علما اور قانون دانوں کو ایک پلیٹ فارم پر لا کھڑا کیا۔ اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ یہاں محض ان خطوط کا اندراج اور ان کے مالہ و ماالیہ کا ذکر مقصود ہے جو وقف کے سلسلہ میں اس عہد کے نامور علما اور وکلا نے علامہ شبلی کو لکھے تھے، جن کی روشنی میں علامہ شبلی کو تحریک وقف علی الاولاد کو آگے بڑھانے اور کامیابی حاصل کرنے میں مدد ملی۔

۱۔ علامہ شبلی نے تحریک وقف علی الاولاد میں سر علی امام [۱۸۶۹۔۱۹۳۲ء] کو بھی شامل کرنا چاہا اور ان سے خط و کتابت کی۔ چنانچہ انھوں نے بھی بڑی دلچسپی لی اور علامہ شبلی کو یقین دہانی کرائی کہ

> ''ضرور اس امر وقف میں ہم مسلمانوں کو پوری اور کامل کوشش کرنی چاہئے کہ فیصلہ پریوی کونسل خلاف قانون اسلام قرار دیا جائے۔ میں مشورہ اور کسی قدر چندہ سے بھی خدمت کرسکتا ہوں''۔

سید علی امام

فروری ۱۹۰۸ء (۱۲)

پریوی کونسل وقف علی الاولاد کو سرے سے وقف ہی تسلیم نہیں کرتی تھی۔ چونکہ سر سید علی امام پریوی کونسل کے فیصلہ کے خلاف ملک گیر تحریک برپا کرنا چاہتے تھے۔ اس لئے چند دنوں بعد دوبارہ انھوں نے علامہ شبلی سے رابطہ قائم کیا اور لکھا کہ

> ''ہم مسلمانوں کو چاہئے کہ تمام ہندوستان میں مجالس کریں، عرض داشت تیار کریں اور حضور وائسرائے کے اور ان کی کونسل کے حاضر ہوں اور نیز سکریٹری آف اسٹیٹ تک سلسلہ جنبانی کریں تاکہ قانون بدلا جائے۔

سید علی امام

۲۲/فروری ۱۹۰۸ء (۱۳)

اسی زمانہ میں کلکتہ کے مشہور قانون داں مولوی محمد یوسف نے اس سلسلہ میں ایک رسالہ تیار کیا (۱۴) اور مسلمانوں میں تقسیم کیا۔ مذکورہ بالا خط کے محض ۳/دن بعد وہ رسالہ سید علی امام کی نظر سے گذرا تو انھوں نے فوراً علامہ شبلی کو ایک مفصل خط لکھا۔ اس سے ان کی تحریک وقف علی

الاولاد سے گہری دلچسپی کا اندازہ ہوتا ہے۔انہوں نے لکھا کہ

مکرم ومعظم! تسلیم عرض ہے۔

جناب مولوی محمد یوسف صاحب کا پمفلٹ میں نے دیکھا ہے۔وہ نہایت پرزوراور قابل تعریف ہے۔ان سے زیادہ اچھا کافی جواب پریوی کونسل کا شاید ہوسکتا ہو۔ ایسی صورت میں اور زیادہ دلائل کی طرف توجہ کرنا تحصیل حاصل ہے۔جس کی ضرورت ہے وہ یہ کہ اسی پمفلٹ کی بنیاد پر ہم مسلمانوں کو چاہئے کہ تمام ہند میں مجالس کریں۔عرض داشت تیار کریں اور حضور میں وائسرائے کے اوران کی کونسل کے حاضر ہوں اور نیز سکریٹری آف اسٹیٹ تک سلسلہ جنبانی کریں ۔تاکہ قانون بدلا جائے اور مسلمانوں کے مذہبی احکام کا خون نہ ہو۔یہ میری رائے ہے۔میں آپ کا اس کام میں اوراس کے ساتھ اورامور میں جو اہم ہوں،ایک ادنی خادم ہوں۔

سید علی امام

۲۵رفروری ۱۹۰۸ء(۱۵)

سرعلی امام ایک ماہر قانون داں اور بیرسٹر تھے۔مسلمانوں میں بھی ان کا خاص اثر تھا۔ (۱۶)ان کی تائیدوحمایت سے یقیناً علامہ شبلی کی تحریک وقف علیٰ الاولاد کوتقویت ملی ہوگی۔

محمد انیس الرحمٰن انیس نے اپنی کتاب ''نواب مؤیدالملک سرعلی امام'' میں لکھا ہے کہ ''وقف بل امپیریل کونسل میں اس لئے منظور ہوکر قانون بن گیا کہ سرعلی امام کے جیسا وزیرقانون وہاں موجود تھا،جس کی تائیداس قانون کوحاصل ہوگئی۔غرض وقف بل کی کامیابی کا سہرا بھی سرعلی امام ہی کے سر باندھنا ہوگا۔اس لئے کہ وزیرقانون اگر قانون کی مخالفت کرتا تو کونسل ایسے قانون کونامنظور کردیتی۔سرعلی امام نے نہ صرف اپنی منظوری دی بلکہ اس قانون کے نوک پلک کوبھی درست کیااوراس کی تمام خامیاں دور کردیں۔اس کے علاوہ ۱۹۱۳ء میں وائسرائے ہند کو رائے دی کہ مسٹر جناح کو کونسل کاممبر نامزد کیا جائے تاکہ وقف بل کومنظور کرنے میں کسی قسم کی دقت پیش نہ آئے۔مسٹر جناح کی نامزدگی اور وقف کی منظوری میں سرعلی امام نے ایک خاموش

مجاہد کا رول ادا کیا۔‘‘(۱۷)

محمد انیس الرحمٰن انیس نے وقف بل کا سارا سہرا سرعلی امام کے سر باندھا ہے۔حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ علامہ شبلی نے کونسل کے تمام ممبران سے مل کر انھیں بل کی حمایت کے لئے آمادہ کیا تھا اور تمام اراکین کی تائید وحمایت سے قانون بنا۔ بہرحال سید علی امام کی تائید وحمایت اور کوششوں سے تحریک وقف علی الاولاد کو یقینی طور پر فائدہ پہنچا۔

۲۔ سر محمد شفیع بیرسٹر [۱۸۶۹-۱۹۳۲ء] اس عہد کے بڑے قانون داں تھے۔۱۸۹۲ء میں لندن سے بیرسٹری کا امتحان پاس کیا۔ وہ امپیریل لجسلیٹو کونسل اور پنجاب لجسلیٹو کونسل کے رکن بھی رہے۔کونسل آف امپائر میں ہندوستان کو شریک کار کا درجہ انھیں کی کوششوں سے ملا تھا۔ وہ علی گڑھ تحریک کے بھی پرزور حامی تھے۔علامہ شبلی سے بھی تعلق تھا۔علامہ کے متعدد خطوط میں ان کا ذکر ملتا ہے۔علامہ شبلی نے انھیں وقف علی الاولاد کے متعلق انگریزوں کے غلط فیصلوں سے آگاہ کیا تو انھوں نے لکھا کہ

> مکرم بندہ جناب مولوی صاحب۔السلام علیکم
>
> مزاج مقدس
>
> میں نے رسالہ وقف مرسلہ جناب بغور مطالعہ کیا۔ اس سے پہلے بھی اس مسئلہ کی نسبت میں نے مختلف کتابیں اور مضامین اس غرض سے دیکھے کہ پریوی کونسل کے فیصلہ کی نسبت اپنی رائے قائم کروں۔ میری قطعی رائے ہے کہ فیصلہ پریوی کونسل شرع محمدی کے اصولوں اور احکام کے برخلاف ہے۔ رسالہ وقف کے مطالعہ سے میری اس رائے کو اور بھی تقویت ہوگئی ہے۔اس امر کے متعلق جناب نے رسالہ میں جو تجویز فرمائی ہے، مجھے اس سے کلی اتفاق ہے۔
>
> راقم نیازمند
>
> محمد شفیع بیرسٹر ایٹ لا
>
> ۱۴؍جون ۱۹۰۸(۱۸)

دو ماہ بعد علامہ شبلی نے جب باقاعدہ انجمن وقف علی الاولاد قائم کی اور مسٹر محمد شفیع کو اس کا

رکن بننے کے لئے خط لکھا تو انھوں نے جواب میں لکھا کہ:

کرم فرمائے بندہ جناب مولانا صاحب.............................السلام علیکم

مزاج شریف

مجھے انجمن وقف سے ہر طرح ہمدردی ہے اور اس کی ممبری بسر وچشم قبول کرتا ہوں۔

والسلام نیازمند

محمد شفیع بیرسٹ ایٹ لا

لاہور۔ ۱۷؍اگست ۱۹۰۸ء (۱۹)

پریوی کونسل کے فیصلوں کے خلاف سلسلہ جنبانی کے لئے علامہ شبلی نے جو وفد تیار کیا تھا اس میں ایک اہم نام علامہ اقبال [۱۸۷۷-۱۹۳۸ء] کا بھی تھا۔ گو ان کی شہرت عالمی شہرت یافتہ شاعر کی حیثیت سے ہے، تاہم ان کا شمار اس عہد کے نامور قانون دانوں میں بھی تھا۔ علامہ شبلی نے تحریک میں شمولیت کے لئے انہیں بھی خط لکھا تھا، مگر علامہ اقبال نے اپنی عدیم الفرصتی کی وجہ سے معذرت ظاہر کی اور پنجاب کی طرف سے مسٹر محمد شفیع بیرسٹر کا نام پیش کیا جو ان دنوں کلکتہ ہی میں تھے۔ (۲۰)

۳۔ وقف کے سلسلہ میں سید امیر حسن خاں سٹی مجسٹریٹ کلکتہ سے بھی علامہ شبلی نے رابطہ قائم کیا تھا۔ چنانچہ انھوں نے بھی علامہ شبلی کی اس تحریک سے اتفاق کیا اور لکھا کہ

''صحیفہ مع کاغذ متعلق وقف علی الاولاد ورود ہوا۔ مجھے تمام تر آپ کی تحریکوں سے اتفاق ہے۔''

امیر حسن

۴؍فروری ۱۹۰۸ء (۲۱)

اس سلسلہ میں مزید ان کی کسی توجہ کا ذکر نہیں ملا اور خود ان کے بارے میں بھی معلومات دستیاب نہ ہو سکیں۔

۴۔ وقف کے سلسلہ میں حامد علی خاں بیرسٹر ایٹ لا لکھنؤ سے بھی علامہ شبلی نے رابطہ قائم کیا اور جب رسالہ وقف علی الاولاد ان کے پاس بھیجا تو انھوں نے لکھا کہ

''عنایت نامہ وتجویز متعلق مسئلہ وقف موصول ہوئے۔ نہایت عمدہ تجویز ہے۔ میرا خیال اس طرف عرصہ سے ہے، بلکہ ایک مسودہ نہایت مدلل اور مفصل لکھ کر ایک صاحب کو دیا تھا۔

حامد علی

۴/فروری ۱۹۰۸ء(۲۲)

۵۔ علامہ شبلی نے جس وقت تحریک وقف علی الاولاد کا آغاز کیا، اس کے کچھ ہی دنوں بعد لندن میں مسلمان قانون دانوں نے اسی طرح کی ایک تحریک کا آغاز کیا۔ سید ظہور احمد بیرسٹر ایٹ لا اس کے رکن تھے۔ انھوں نے علامہ شبلی کو لکھا کہ

''جسٹس امیر علی صاحب سے اس کے متعلق پوری باتیں ہوئیں۔ ان کی رائے ہے کہ گورنر جنرل ہند سے درخواست کی جائے کہ وہ محمڈن لا کے منشاء کے موافق علماء کی رائے سے ایک قانون اوقاف کے متعلق پاس کر دیویں۔ پریوی کونسل کو اس پر کچھ اعتراض نہ ہوگا۔ ہم مسلمانان موجودہ لندن جن کا تعلق قانون سے ہے آپ کو یقین دلانا چاہتے ہیں کہ ہم ہر قسم کی خدمت جو ہم سے آپ اس کے بابت یہاں لینا چاہیں بجالانے کو تیار ہیں۔

سید ظہور احمد

۱۳/مارچ ۱۹۰۸ء، لندن (۲۳)

۶۔ لندن میں جو وقف کمیٹی قائم ہوئی تھی مولوی محمد شریف بھی اس کے ایک رکن تھے۔ لکھنؤ اور لندن کی وقف کمیٹیوں میں افہام وتفہیم اور مشترکہ کے لئے انھوں نے علامہ شبلی کو خط لکھا کہ

''وقف اولاد کے مسئلہ کی ترمیم کے متعلق یہاں وقف کمیٹی قائم ہوئی ہے۔ چونکہ کوئی کام اس کے متعلق بلا آپ لوگوں کی رائے کے طے کرنا مناسب نہیں ہے، اس لئے اس کی اطلاع آپ کو دیتا ہوں۔ غالباً سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا کے پاس یا تو ڈیپوٹیشن یا موریل مع دیگر کاغذات کے ان شاء اللہ جلد پہنچے گی۔ اس کی اطلاع آپ لوگوں کو دیں گے۔ کم سے کم اس سے آپ کو ترمیم قانون میں مدد ملے گی۔ ہمارے

پریزیڈنٹ ڈاکٹر سید عبدالمجید نے وقف پر ایک ایڈریس محض بغرض فائدہ رسانی اس مسئلہ کے سوسائٹی آف کمپریٹو لجسلیشن کے سامنے پڑھا۔ آپ جو کام اس کے متعلق کرنا چاہیں اس کی اطلاع دیجئے گا۔ اگر ہم لوگوں کی مدد کی ضرورت ہوگی تو ان شاء اللہ ہرگز پہلوتہی نہ کریں گے۔ کل ممبران کمیٹی آپ کو سلام کہتے ہیں۔

محمد شریف

لندن ۴؍دسمبر ۱۹۰۸ء (۲۴)

۷۔ وقف کمیٹی لندن کے صدر ڈاکٹر عبدالمجید نے بھی علامہ شبلی کو خط لکھ کر اپنے خیالات سے آگاہ کیا۔ انھوں نے لکھا کہ

''بلگرامی صاحب نے معاملہ وقف میں میری بڑی مدد کی اور اگر افسوس ناک حالت اس ادبار زدہ قوم کی نہ ہوتی تو آج تک ڈیپوٹیشن جو کہ لارڈ مالے نے قبول کر لیا تھا جا چکا ہوتا۔ میں بخیال اس کے کہ ولایت کے بڑے بڑے مصنف کی رائے مسئلہ وقف پر لوں سوسائٹی آف کمپریٹو لجسلیشن میں بہ ہزار مشکل وقت پر ایک لکچر دینے کی اجازت لی۔ سر ریمنڈس وغیرہ نے وقف علی الاولاد پر میرا سپورٹ کیا۔ چنانچہ اس کا حال ہمارے لکچر سے جس کی کاپیاں بھیج چکا ہوں، معلوم ہوا ہوگا۔ آپ کے رسالے کا ترجمہ میں ہندوستان میں پہنچ کر ایک آدھ دن میں کر دوں گا۔ کوئی ایسا قانون دنیا میں جس کو معاملہ وقف سے تعلق ہو نہیں ہے، جس کو میں نے غور نہ کیا ہو۔

عبدالمجید

لندن نومبر ۱۹۰۹ء (۲۵)

اس خط سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ علامہ شبلی نے بیرسٹر عبدالمجید سے بھی رسالہ وقف علی الاولاد کے ترجمہ کی خواہش کی تھی۔

۸۔ پروفیسر سید نواب علی [۱۸۷۷-۱۹۶۱ء] بڑودہ کالج بڑودہ کے پروفیسر اور علامہ شبلی کے احباب میں تھے۔ ان کے یہاں یعنی مشرقی بنگال میں ایک دوسرا مسئلہ در پیش تھا۔ وہ یہ کہ مسلمان سٹل اسٹیٹ قانون کے بجائے وقف علی الاولاد کی طرف کیوں متوجہ ہوئے ہیں؟ اس مسئلہ

کو سمجھنے کے لئے پروفیسر سید نواب علی نے علامہ شبلی کو خط لکھا کہ

جناب سامی کو کاغذات وقف بھیجنے کی تکلیف اس لئے دی گئی کہ ان دنوں ہماری مشرقی بنگال گورنمنٹ سے اس مضمون کی تحریر ملی کہ مسلمانان سٹل اسٹیٹ کے قانون سے فائدہ نہ لے کر کیوں وقف علی الاولاد کی طرف مشغول ہوئے ہیں۔ لیکن مسلمانوں نے وقف اولاد کے بجائے سٹل اسٹیٹ کے تسلیم کرنے سے انکار کیا۔(۲۶)

نواب علی

۹۔ مسٹر مظہر الحق بیرسٹر [۱۸۶۶ء۔۱۹۳۰ء] نے بھی وقف علی الاولاد سے بہت دلچسپی لی اور علامہ شبلی سے مسلسل رابطے میں رہے۔ مفید مشورے دیئے۔ علامہ شبلی کا خیال تھا کہ جب تک پریوی کونسل کے ممبران کو راضی نہ کیا جائے وقف علی الاولاد کے لئے قانون بننا مشکل ہوگا۔ یہ کام مسٹر مظہر الحق نے انجام دیا۔ اس کے لئے انھوں نے جو کوشش کی اس کی اطلاع دیتے ہوئے علامہ شبلی کو لکھا کہ:

''میں اس دفعہ حضور وایسرائے کی کونسل کی میٹنگ میں جو شملہ میں ہوئی تھی شریک ہوا تھا اور اس موقع کو غنیمت سمجھ کر مسئلہ وقف علی الاولاد پر قریب قریب کل ممبران کونسل سے گفتگو کی۔ بعض موافق تھے بعض مخالف۔...... اگر جناب مدد کریں کے تو پھر میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ ان شاء اللہ آئندہ موسم سرما میں قانون ضرور پاس ہوجائے گا''۔

مظہر الحق

۱۶/اگست ۱۹۱۰ء(۲۷)

علامہ شبلی نے اس خط کے اخیر میں یہ جملہ لکھا ہے کہ ''خدا اس پیشین گوئی کو پورا کرے۔'' اور پھر علامہ شبلی نے خود کلکتہ کا سفر کیا اور تمام اراکین کونسل سے ملاقات کر کے مسئلہ کو طے کیا۔

مسٹر مظہر الحق کے ایک اور خط کے اقتباس سے ان کی وقف علیٰ الاولاد سے بڑھی ہوئی دلچسپی کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

''میں مسودہ قانون تیار کر رہا ہوں۔ کام ذرا مشکل اور غور طلب ہے۔ بہت سی کتابوں کے دیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔'' (۲۸)

علامہ شبلی نے تحریک وقف علی الاولاد کا دائرہ پورے ملک میں وسیع کر دیا تھا اور وہ اس کے لئے اپنے احباب سے مسلسل مشورے کر رہے تھے اور اسے مستحکم کرنے کے لئے جو کوشش کر رہے تھے مسٹر مظہر الحق نے اس میں شاید سب سے زیادہ علامہ شبلی کا تعاون کیا۔ ان کے درج ذیل خط سے اس کا کسی قدر اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ علامہ شبلی نے تمام ملک میں تائیدی دستخط حاصل کرنے کے لئے ایک فارم بھیجا تھا، اس کے متعلق لکھتے ہیں۔

''مجھے یہ معلوم ہونا چاہئے کہ صوبہ بہار سے بھی دستخط جناب کے پاس پہنچے ہیں یا نہیں۔ کلکتہ سے آپ مطمئن رہیں میں اس کو اپنے ہاتھ میں لیتا ہوں اور ان شاء اللہ وہاں کے کل عمائدین کے دستخط آپ کے پاس پہنچ جائیں گے۔ بمبئی میں جناب ضرور مسٹر محمد علی جناح کو لکھیں، وہ اس کا انتظام کر دیں گے۔ میری رائے ناقص میں اگر ڈیپوٹیشن جائے تو صرف وہ حضرات ہی اس میں شریک نہ ہوں جن کو اس وقت تک گورنمنٹ میں رسوخ رہا ہے، بلکہ علما اور مرشدین، صاحب اثر اور اہل الرائے حضرات بھی اس میں شریک ہوں''۔

مظہر الحق

ستمبر ۱۹۱۰ء (۲۹)

۱۰۔ نواب سچین قسمت بمبئی کے بارے میں ہمارے پاس کوئی تفصیل نہیں۔ انھیں تحریک وقف علی الاولاد کی دستخطی مہم کی جب اطلاع ملی تو انھوں نے خود سے اپنی خدمات پیش کیں اور علامہ شبلی کو لکھا کہ

''جناب والا نے جو اسکیم وقف علی الاولاد کی تجویز فرمائی ہے وہ مسلمانوں کے قدیم خاندانوں کے حق میں رحمت مجسم ہے۔ میں بھی درخواست کرتا ہوں کہ جناب والا اگر موریل تیارہ شدہ کو یہاں بھیج دیں تو میں خود اس پر دستخط کر دوں گا اور دیگر معزز اصحاب بمبئی پریسیڈنسی سے دستخط کراؤں گا۔''

سچین قسمت

بمبئی۔۲۹؍اکتوبر۱۹۰۹ء(۳۰)

۱۱۔ علامہ شبلی نے سر راجہ علی محمد خاں [۱۸۷۸۔۱۹۳۱ء] والی محمود آباد سے بھی تحریک وقف علی الاولاد میں شمولیت کی درخواست کی اور ان کے پاس اس سلسلہ کی تجاویز وغیرہ بھیجیں۔ انھوں نے بھی اس سے اتفاق کیا اور علامہ شبلی کو لکھا کہ

''صحیفہ گرامی صادر ہوکر باعث افتخار دارین ہوا۔ مجھے رائے عالی سے سراسر اتفاق ہے۔ واقعی معاملہ وقف اولاد ایک نہایت ضروری مسئلہ ہے۔ اوقاف کی خرابیاں گو کہ اور بھی قابل توجہ وملاحظہ ہیں، لیکن سب سے پہلے اس مسئلہ کا دست بابرکت سے انجام پانا بہت مناسب ہے۔ میں بہت جلد فارم دستخط کرا کے ارسال خدمت کروں گا۔''(۳۱)

علی محمد خاں

۱۲۔ سر راجہ تصدق رسول خاں والی ریاست جہاں گیر آباد (کے سی، ایس، آئی) سے بھی علامہ شبلی نے وقف علی الاولاد کے سلسلہ میں خط وکتابت کی۔ ان کے پاس دستخطی فارم بھی بھیجے، مگر وہ ان کے پاس نہیں پہنچے تو انھوں نے لکھا کہ

''مسئلہ وقف اولاد کے متعلق اخبارات میں مضامین البتہ دیکھے گئے، مگر ہمارے ہاں کوئی فارم آں جناب کے ہاں سے موصول نہیں ہوا۔ اگر فارم آیا ہوتا تو تعمیل ارشاد میں حتی الوسع کوشش کی جاتی۔''

تصدق رسول خاں

۲۴؍اکتوبر۱۹۰۹ء(۳۲)

مرشدآباد کے خان بہادر فضل ربی نے بھی تحریک وقف علی الاولاد سے خاص دلچسپی لی اور علامہ شبلی کو لکھا کہ

''وقف علی الاولاد کے لئے جو مجلس قائم ہوئی ہے اس کی ممبری میں حقیر کو شامل کیا جاوے۔ عرض داشت پر دستخط کرنے کے لئے جو فارم ہے حقیر کے پاس ارسال

فرمائیں تا کہ یہاں سے اکثر اشخاص کے دستخط کراکے آپ کی خدمت عالی میں بھیجوں، ان شاء اللہ تکمیل فارم دستخطی زر چندہ بھی بھیجا جائے گا۔ زیادہ۔ والسلام

فضل ربی

۲۷راگست ۱۹۰۹ء(۳۳)

چنانچہ علامہ شبلی نے ان کے پاس فارم اور تجاویز وغیرہ بھیجیں۔ اس کے جواب میں انہوں نے لکھا کہ

جناب من!

فارم دستخطی بھیجتا ہوں۔ دستخط کنندگان اکثر تعلقہ داران وزمینداران جو مختلف اطراف اور مقاموں میں رہتے ہیں اس لئے بھیجنے اور دستخط کرانے میں تاخیر ہوتی ہے۔ چند فرد فارم جس پر دستخط ہو چکے ہیں آپ کی خدمت میں بھیجتا ہوں۔ باقی جلد ان شاء اللہ بھیجوں گا۔ زیادہ والسلام

احقر فضل ربی

مرشدآباد۔ ۱۹راکتوبر ۱۹۰۹ء(۳۴)

نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی [۱۸۴۲-۱۹۲۶ء] علامہ شبلی کے خاص کرم فرما اور محسن تھے۔ انھوں نے متعدد مواقع پر علامہ شبلی کا تعاون کیا اور وہ بھی مدۃ العمر ان کے خیر خواہ رہے۔ نواب صاحب مرحوم ان لوگوں میں سے تھے جنھوں نے علامہ شبلی سے پہلے وقف علی الاولاد کے مسئلہ کی طرف توجہ کی، مگر ان کی کوشش رائے اور خیال سے آگے نہ بڑھ سکی تھی۔ علامہ شبلی نے انھیں متوجہ کیا تو انھوں نے درج ذیل خط لکھا۔

مخدوم گرامی

وقف اولاد کا مسئلہ بہت ہی اہم مسئلہ ہے اور اس میں ضرور کوشش کرنی چاہئے۔ میں اس بارہ میں سال گذشتہ ایک یادداشت سکریٹری آف آسٹیٹ کی خدمت میں پیش کر چکا ہوں مگر جب تک کہ یہاں سے جمہوری سعی وکوشش نہ ہو کچھ نہ ہوگا۔

دوسرا امر یہ ہے کہ سعی ممتد ہو، یعنی ایک مرتبہ عرض داشت بھیجنے پر اکتفا نہ ہو، بلکہ ہر

طرف سے اس معاملہ میں ایک مدت تک چھیڑ چھاڑ جاری رہے اور اخباروں میں مضامین چھپتے رہیں۔ پریوی کونسل کے فیصلہ کی غلطی ہر طرف سے اور ہر جہت سے ثابت کی جائے۔ علماء کے فتوے جمع کئے جائیں، اور چھاپے جائیں۔

تیسرا ضروری امر یہ ہے کہ جو کچھ لکھا پڑھا جائے انگریزی زبان میں بھی ضرور ہو، تا کہ اس کا اثر ولایت تک پہنچے۔

سید حسین بلگرامی

۲۸/جنوری ۱۹۰۹ء (۳۵)

علامہ شبلی نے نواب عماد الملک کے مشوروں پر خاص توجہ دی۔ تحریک وقف علی الاولاد کو مسلسل جاری رکھا۔ اخبارات میں مضامین اور خبریں شائع کرائیں۔ ہندوستان کے تقریباً تمام سربرآوردہ اشخاص سے رابطہ قائم کیا، اور انہیں پریوی کونسل کے غلط فیصلوں سے آگاہ کیا۔ علماء کو ساتھ لیا۔ ان سے فتاوے حاصل کئے اور انھیں کتابی صورت میں شائع کرایا۔ ہاں انگریزی زبان میں اس سلسلہ میں کیا ہوا اس کی تفصیلات ہنوز دستیاب نہیں ہوسکی ہیں۔ غالبًا انگریزی سے عدم واقفیت کے سبب اس کی طرف وہ خاطر خواہ توجہ نہ کر سکے۔ بہر حال تنہا انھوں نے اس تحریک کو ملک گیر بنا دیا۔

۱۵۔ مولوی فضل حسین [۱۸۹۷-۱۹۳۶ء] بیرسٹرایٹ لا، لاہور نہایت قابل اور بڑے بااثر شخص تھے۔ علامہ شبلی نے انھیں بھی وقف علی الاولاد کے سلسلہ کے پمفلٹ اور فارم بھیجے۔ اس کے جواب میں انھوں نے لکھا کہ

مکرمی مولانا صاحب زادعنایتہٗ السلام علیک

مجھے جناب کی چٹھی متعلق مسئلہ وقف اولاد دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ اس مسئلہ کے متعلق اور دو ایک اور مسائل کے متعلق سید امیر علی صاحب بہادر سے میں خط و کتابت کرتا رہا ہوں اور چند سال سے مجھے خیال تھا کہ لاہور کی انجمن مستشار العلماء کے توسط سے ہندوستان کے فقہاء سے ایک فتوی لینا چاہئے جو ہر ایک مسئلہ کا مدلل طرز پر تصفیہ کرے اور شمس العلماء مفتی محمد عبد اللہ صاحب پروفیسر اورینٹل کالج لاہور

وسکریٹری انجمن مستشار العلماء سے بھی ذکر کرتا رہا، جو کام آئندہ کرنا چاہتے ہیں
ضروری ہے اور عمدہ ہے۔ آپ کا نیاز مند
فضل حسین بیرسٹرایٹ لا
۱۷رجنوری ۱۹۰۸ء(۳۶)

۱۶۔ حاذق الملک حکیم محمد اجمل خاں [۱۸۶۸-۱۹۲۷ء] کو بھی علامہ شبلی نے اس تحریک وقف علی الاولاد میں شامل کرنا چاہا، مگر انھوں نے تمام تر اتفاق کے باوجود معذرت نامہ پیش کر دیا کہ

مکرم بندہ جناب مولانا شبلی صاحب زاد لطفکم السلام علیکم
افسوس ہے کہ آپ کی تحریر کا مفصل جواب بوجہ عدیم الفرصتی و تنگی وقت کے نہ دے سکا اور دیر ہوئی، مگر مجھ کو مسئلہ وقف میں آپ کی تحریر اور رائے سے اتفاق ہے۔ میں خوشی سے اپنی مفصل رائے اس ضروری مسئلہ کے متعلق دیتا، لیکن طبی مشاغل نے میرے دست و پا باندھ رکھے ہیں۔
اجمل خاں
۲۸رفروری ۱۹۱۸ء(۳۷)

۱۷۔ ۱۸راگست ۱۹۰۹ء کے انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں مسئلہ وقف اولاد پر مضمون شائع ہوا اور جناب صادق علی وزیر ریاست خیر پور سندھ کی نظر سے گذرا تو انھوں نے علامہ شبلی کو لکھا کہ

''جناب مولانا شمس العلماء شبلی نعمانی صاحب جل مجدکم
السلام علیکم و علی من لدیکم
انسٹی ٹیوٹ گزٹ علی گڑھ ۱۸راگست ۱۹۰۹ء کے مطالعہ سے احوال مسئلہ وقف علی الاولاد کا بالتفصیل معلوم ہوا۔ درحقیقت یہ مسئلہ مسلمانوں کے لئے اس وقت میں برابر ذریعہ حفظ المال والملک ہے۔ چونکہ آنجناب ایدکم اللہ اس مسئلہ میں از حد کوشش فرما رہے ہیں امید کہ آپ کا سعی مشکور ہوگا۔ لہٰذا ہمارا ارادہ ہے کہ علاقہ سندھ میں بھی اس امر کے متعلق کوشش کی جاوے۔ بناءعلیہ مکلّف کو مہربانی فرما کے وہ رسالہ جو آپ نے بالخصوص اس مسئلہ کے متعلق لکھا ہے اور دوسرے ضروری کاغذات مع چند فارم

عرض داشت داعی الخیر کے نام ارسال فرمائیں گے، تا کہ اس مسئلہ پرغور کیا جاوے۔

زیادہ والسلام

صادق علی

وزیر ریاست خیر پور سندھ

۲۲ راگست ۱۹۰۹ء (۳۸)

وزیر مرحوم کی حسب خواہش کاغذات بھیج دیئے گئے تو انھوں نے بے حد دلچسپی سے سندھ کے بڑے بڑے لوگوں سے دستخط کرا کے بھیجے۔ وہ ایک خط میں لکھتے ہیں:

جناب مولانا شمس العلماء شبلی نعمانی صاحب جل مجدکم

السلام علیکم

جناب کے ارشاد کے بموجب تعلیمات فارم جن پر سندھ کے بڑے بڑے لوگوں کی تصدیق کی صحیح ہے، بذریعہ ہذا مرسل خدمت ہیں اور سندھ کے تمامی مسلمان اس مسئلہ میں آپ سے متفق الرائے ہیں۔ زیادہ والسلام

صادق علی

۱۰ رفروری ۱۹۱۰ء (۳۹)

۱۸۔ محمد عبدالقدوس بادشاہ کو رسالہ وقف اولاد مصنفہ علامہ شبلی نعمانی کی اطلاع ملی تو انھوں نے علامہ کو لکھا کہ

جناب مستطاب محامد مآب مولوی مولانا محمد شبلی صاحب نعمانی دام اشفاقہ

بعد سلام مسنون واشتیاق ملاقات مسرت آیات واضح ہو کہ بفضلہ تعالی خیریت حاصل ومطلوب ومرغوب، آپ نے جو دربارہ مسئلہ وقف علی الاولاد تصنیف فرمائے ہیں اس کی مجھے ضرورت ہے اور یہ بالکل اہم مسئلہ ہے۔ جس کو تمام علماء کو بتلانا لازم ہے، اس لئے ایک نسخہ مجھے بھی روانہ فرمادیں تا کہ میں یہاں کے علماء کو بھی بتلاؤں۔ اس کو ویلو پی اے بل روانہ کریں۔ میرا پتہ یہ ہے۔ فقط

محمد عبدالقدوس بادشاہ

۲۹/محرم الحرام ۱۳۲۸ء(۴۰)

۱۹۔ مولوی محمد یوسف صاحب کلکتہ جنھوں نے ابتدا ہی سے مسئلہ وقف علی الاولاد سے دلچسپی لی اور ایک عرضداشت کے ذریعہ لوگوں کو متوجہ کیا تھا، وہ علامہ شبلی کے رابطہ میں رہے اور ایک دوسرے سے مشورہ کرتے رہے۔ انھوں نے علامہ شبلی کو اپنے خطوط میں متعدد مشورے بھی دیئے۔ ان کا ایک مشورہ یہ تھا کہ

''دوسرا طریقہ یہ ہے کہ تمام ہندوستان سے درخواست گورنمنٹ میں دی جائے کہ وقف کا قاعدہ شرع کی رو سے ہے۔ اس کو آئین میں مندرج کر دیا جائے تا کہ پریوی کونسل کے فیصلہ کا اثر نہ رہے۔ رقیمہ نیاز

محمد یوسف

کلکتہ۔ ۱۹/مارچ ۱۹۰۹ء(۴۱)

علامہ شبلی نے انھیں بھی انجمن وقف علی الاولاد کی رکنیت کی پیشکش کی اور انھوں نے بسر وچشم قبول کرتے ہوئے لکھا کہ

''معظم ومکرم شمس العلما جناب مولانا شبلی نعمانی صاحب دام اجلالکم سلام مسنون الاسلام کے بعد ملتمس ہوں کہ قطعہ عنایت نامہ مرقومہ ۶/جولائی ۱۹۰۹ء کو معہ فارم برائے دستخط وکیفیت انجمن مرسلہ جناب نے ورود پا کر مجھ کو نہایت محفوظ ومسرور کیا ع

اے وقت تو خوش کہ وقت ما خوش کردی

اور میں آپ کی اس عنایت کا تہِ دل سے ممنون ومشکور ہوں۔

فارم جو آپ نے دستخط کے لئے عنایت فرمایا ہے بہت جلد دستخطوں سے لوگوں کے مزین کرا کر ارسال خدمت کروں گا۔

مجھ کو انجمن وقف کی ممبری منظور کرنے میں کوئی عذر نہیں ہے۔ میں نے بسر وچشم ممبری وقف کی منظور کی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ حتی الوسع انجمن کی ترقی میں کوشاں وساعی رہوں گا۔ رقیمہ نیاز

محمد یوسف کلکتہ

۱۷؍اگست ۱۹۰۹ء (۴۲)

۲۰۔ اس قدر بڑی اور ملک گیر تحریک علامہ شبلی کے ذریعہ قائم ہوا اور اس میں حبیب شبلی کی شرکت نہ ہو یہ کیسے ممکن تھا۔ چنانچہ تحریک وقف علی الاولاد سے ابتدا ہی میں علامہ شبلی نے جن لوگوں کو آگاہ کیا ان میں ایک مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی [۱۸۶۴-۱۹۵۰ء] بھی شامل تھے۔ انھوں نے اگر چہ اتفاق کیا تاہم اپنے خدشات سے بھی آگاہ کیا۔ انھوں نے لکھا کہ

حضرت علامی!

۲۹؍جنوری (۱۹۰۸ء) کا والا نامہ پہنچا۔ جس مسئلہ کو آپ ہاتھ میں لے رہے ہیں وہ نہایت اہم اور ضروری معاملہ ہے۔ اگر آپ کے مساعی جمیلہ سے طے ہوجائے تو امت کی بہت بڑی خدمت ہوگی اور مسلمان خاندان عظیم الشان تباہیوں سے بچ جائیں گے اور تو تمام مراحل آپ کی بلند ہمت طے کرلے گی، شبہہ اور اندیشہ جو کچھ ہے وہ ندوہ کی بابت ہے، یعنی علماء کا دستخط کردینا۔ اگر یہ امر جلسہ میں بالاتفاق طے ہوجائے تو پھر راستہ چنداں دشوار گذار نہیں۔

اس مرحلہ کے طے ہونے کی کیا تدبیر آپ نے خیال فرمائی ہے۔ دیوبند وغیرہ کس طرح ہم آہنگ ہوں گے۔

میں جو کچھ خدمت اس معاملہ کر سکتا ہوں اس کے لئے حاضر ہوں۔ جو وقتاً فوقتاً آپ ارسال کرتے جائیں گے، تعمیل ہوتی جائے گی۔ بہر حال کام ضروری اور کرنے کے لائق ہے۔ کیا عجب ہے جو آپ کے ہاتھوں سے اس کا انصرام مقدر ہو۔

نیاز مند

حبیب الرحمٰن

۳؍فروری ۱۹۰۸ء (۴۳)

ظاہر ہے ندوے کے معاملات کا حبیب شبلی سے زیادہ اندازہ داں کون ہوسکتا تھا، اس لئے کہ وہ موافق ومخالف دونوں گروہ کے معتمد الیہ تھے۔ چنانچہ ان کا خدشہ ایک معنوں میں درست

بھی نکلا کہ اس اہم کام کا جس کی اہمیت وضرورت کا ہر شخص معترف تھا، مولوی خلیل الرحمٰن سہارن پوری نائب ناظم ندوہ نے ندوہ کے اجلاس میں اکیلے ہی سہی مخالفت کی قرارداد پیش کی۔ مگران کے علاوہ ارکان نے متفقہ طور پر اسے منظور کر دیا۔ البتہ دیوبند کی طرف سے شروانی صاحب نے جس خدشے کا اظہار کیا تھا وہ یقینی طور پر بے بنیاد تھے اور بے بنیاد ثابت ہوئے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے ایک شخص نے بھی اس کی مخالفت نہیں کی اور ملک کے طول وعرض میں جہاں جہاں علامہ شبلی کا رسالہ وقف علی الاولاد پہنچا وہاں وہاں لوگوں نے تائید کی۔ جو عرض داشت بھیجی گئی تھی اس سے بھی اتفاق کیا گیا اور فارم پر کر کے بھیجے۔ اسے ملک گیر بنانے میں تقریباً ہر مکتبہ فکر کے لوگوں نے حصہ لیا۔ حتی کہ آل انڈیا شیعہ کانفرنس نے بھی اس کی تائید کی اور متعدد شیعہ علماء نے تائیدی فارم پر دستخط کر کے بھیجے۔

۲۱۔ مشیر حسین قدوائی رئیس گدیہ ضلع بارہ بنکی علامہ شبلی کے احباب میں تھے اور جب علامہ شبلی نے ان کے پاس انجمن وقف کے کاغذات بھیجے تو انھوں نے دوست ہی کی طرح جواب لکھا۔

''جناب محترم مولانا شبلی صاحب تسلیم!

آپ کا والا نامہ آج مع کاغذات وقف ملا۔ مضمون کو میں اودھ اخبار میں قبل ہی دیکھ چکا تھا۔ میں تینوں طرح سے مدد دینے کو تیار ہوں۔ جو مشورہ میں دے سکوں گا اس میں کوتاہی نہ کروں گا۔ چندے کے طور پر میں انگریزی رسالہ کی چھپوائی وغیرہ میں مدد دوں گا اور ترتیب وترجمہ کو اپنے ذمہ لوں گا۔ یہاں گورنمنٹ میں افکار ہو رہے ہیں اور کامیابی کی صورت بھی اختیار کر رہے ہیں۔

مشیر حسین قدوائی

۳۱رجنوری ۱۹۰۸ء(۴۴)

۲۲۔ نواب مزمل اللہ خاں [۱۸۶۵-۱۹۳۸ء] رئیس علی گڑھ علامہ شبلی کے مخلصین میں ایسے شخص تھے جو ہمیشہ اور ہر معاملہ میں ان کے ساتھ رہے۔ اصلاً ''حبیب شبلی'' یہی تھے۔ علامہ شبلی نے جب بھی کوئی علمی، دینی اور تعلیمی تحریک شروع کی تو انھوں نے تائید وحمایت کے ساتھ مالی

تعاون ضرور پیش کیا۔ان سے اوران کے خانوادہ سے علامہ شبلی کے تعلق کا اندازہ نواب صاحب کی صاحبزادی مرحومہ ز، خ، شروانیہ کے مرثیہ شبلی سے لگایا جاسکتا ہے، جوان کے مجموعۂ کلام میں شائع ہو چکا ہے۔راقم نے اس مرثیہ کو اپنی کتاب ''شبلی سخنوروں کی نظر میں'' میں بھی شامل کیا ہے۔(۴۵)

علامہ شبلی نے جب نواب مزمل اللہ خاں صاحب کو انجمن وقف علی الاولاد میں شامل کرنا چاہا اوران کے پاس ممبری فارم وغیرہ بھیجے تو انھوں نے نہایت محبت کے ساتھ اسے قبول کیا اور بڑے والہانہ انداز میں لکھا کہ

جناب مخدومی ومطاعی مدظلکم العالی

ہدیہ سلام مسنون کے بعد گرامی نامہ سامی وکاغذات متعلقہ مسئلہ وقف علی الاولاد کے رسید بمنت پذیری تمام عرض کرتا ہوں۔

میں اس مسئلہ کے مہتم بالشان اور مفید عام اہل اسلام ومعرکۃ الآراء ہونے کا قائل ہوں اوراس کے متعلق ہر قسم کی مدد کی طرف مائل بلکہ مستعد، عرصہ سے اس کا ذکر اخبارات میں پڑھتا ہوں، مگر چونکہ اس وقت تک سعادت مخاطبت سے محروم تھا لہٰذا بمصداق

بلبل ز ادب یا نہ نہد در صف گلزار　　تا بہ طلب گارے او لب نکشاید

اپنی طرف سے اقدام نہیں کرسکا۔

اول مجلس وقف علی الاولاد کی ممبری کو اپنی عزت کا باعث سمجھ کر قبول کرتا ہوں۔دوم عرض داشت پر اپنے دستخط کر چکا ہوں اور توابع کے کرا چکا ہوں۔سوم ایک سوروپیہ کی ناچیز رقم بطور چندہ عندالضرورت حاضر کرنے کا وعدہ کرتا ہوں اور بالآخر آپ کے اس مبارک، معزز، مفید اور معرکۃ الآراء مقصد میں کامیابی کی دعا کرتا ہوں۔والسلام

مزمل اللہ

۲۵/اگست ۱۹۰۹ء(۴۶)

۲۳۔ صاحب کتاب الہدیٰ سیٹھ یعقوب حسن آنریری سکریٹری مسلم لیگ مدراس نے بڑے جوش وولولہ کے ساتھ تحریک وقف علی الاولاد میں شرکت کی۔اولاً علامہ شبلی نے انھیں وقف

علی الاولاد کی طرف متوجہ کیا اور جس طرح وہ تحریک وقف علی الاولاد کا دائرہ آہستہ آہستہ پورے ملک میں پھیلا رہے تھے، اس سے سیٹھ یعقوب حسن صاحب کو آگاہ کیا تو انھوں نے مدراس اور اس کے قرب وجوار میں انتہائی سرگرمی سے اس کی طرف توجہ کی اور اس علاقہ کے علماء وفضلا اور ارکان مسلم لیگ میں ایک روح پھونک دی۔ ان کا خط ملاحظہ ہو۔ وہ لکھتے ہیں:

مخدومی، معظمی مولانا مولوی شبلی صاحب نعمانی، لکھنؤ

تسلیم!

مسئلہ وقف اولاد کے متعلق کارروائی کرنے کا جو بیڑہ آپ نے اٹھایا ہے اس سے قوم کو بڑی طمانیت ہوئی اور جو اصحاب کہ مسلمانوں کے لئے اس کو مفید سمجھتے ہیں اور جن کا عدد بڑا ہے۔ اس بارے میں آپ کو تائید دینے پر آمادہ ہیں۔ آپ نے جو کچھ ابتدائی کارروائی کی اس سے واقف ہوتے ہی میں نے ارادہ کرلیا کہ جنوبی ہند میں مدراس پریسیڈنسی مسلم لیگ باضابطہ اور کانسی ٹیوشنل کارروائی شروع کرے اور اس مقصد کی اشاعت کو اجتماعی حیثیت سے کر کے آپ کا ہاتھ بٹائے، چنانچہ لیگ کے پہلے سالانہ جلسہ منعقدہ ۲۳/ اکتوبر میں اس مضمون کو پیش کیا گیا۔ ممبران لیگ کے علاوہ تمام مسلمانان مدراس کو اس جلسے میں شامل ہونے کی عام اطلاع اور دعوت دی گئی۔ مور پیا ویلین میں جو بڑا ہال ہے تقریباً سات سو مسلمان جمع ہوئے تھے اور آنے والوں کے لئے جگہ باقی نہیں رہی تھی، مولانا مولوی محمد عبدالجبار صاحب پروفیسر مدرسہ باقیات صالحات ویلور جو مشہور واعظ اور مقرر ہیں اس مسئلہ کو بذات خود پیش کرنے کو تشریف لائے تھے۔ شہر کے کئی علماء بھی شریک جلسہ تھے۔ مولوی محمد عبدالجبار صاحب نے ایک عالمانہ بسیط تقریر میں اس مسئلہ کو بیان کیا اور تمام حاضرین کے اتفاق سے یہ رزولیشن پاس ہوا کہ مدراس پریسیڈنسی مسلم لیگ اس اہم مسئلہ کے اصول کو گورنمنٹ سے تسلیم کرانے کے متعلق ضروری کارروائی کرے۔ اب عملی کارروائی فرداً فرداً ہونے کے علاوہ اضلاع میں بھی جلسے کرنے کا بندوبست ہورہا ہے۔ جو رسالے اور قطعہ ہائے تصدیقی آپ نے روانہ کئے ہیں، احاطہ مدراس میں

شائع کرنے کے لئے کافی نہیں ہیں۔ پچاس رسالے اور سو فارم موجودہ ضروریات کے لئے روانہ فرمائیے، بالفعل لجسلیٹو کونسلوں کے لئے ممبروں کے انتخاب پر لیگ کی توجہ مبذول ہے۔ اس مرحلے کو طے کرنے کے بعد وقف اولاد پر مزید کارروائی کی جاوے گی۔

یعقوب حسن

آنریری جوائنٹ سکریٹری مسلم لیگ

۱۴ر نومبر ۱۹۰۹ء (۴۷)

۲۴۔ علامہ شبلی جب انجمن وقف علی الاولاد کا دائرہ ہر بڑے شہر تک پھیلا رہے تھے، اس وقت بنارس میں انجمن تہذیب الاخلاق کے نام سے ایک انجمن سرگرم عمل تھی۔ اس کے سکریٹری محمد علی صاحب تھے۔ جن کے بارے میں معلومات نہ مل سکیں۔ بحیثیت سکریٹری علامہ شبلی نے انجمن وقف علی الاولاد کی جانب ان کی توجہ مبذول کرائی تو اس کے جواب میں انھوں نے لکھا کہ

دامت معالیکم، سلام علیکم

کارروائی انجمن وقف علی الاولاد مع فارم تصدیق موصول ہوئی۔ انجمن اس کارروائی سے پہلے سے متفق ہے اور اب اس مجموعی قوت کے ساتھ جس کارروائی کا آپ نے ارادہ کیا ہے، اس پر شکرگذاری کے ساتھ آپ کا ساتھ دیتے ہیں۔ اس کارروائی سے آپ محض حمایت اسلام کا شرف نہ حاصل کریں گے بلکہ اہل اسلام پر احسان کریں گے۔ اس کارروائی کے متعلق حسب ذیل رزولیشن انجمن کے اجلاس ۱۰ر اکتوبر ۱۹۰۹ء میں پاس ہوئے ہیں، جو منسلک فارم تصدیق دستخطی مسلمانان بنارس وغیرہ ارسال ہیں۔ امید کہ رسید سے مطلع فرمائیے گا اور اس کے متعلق جو کارروائی ہوا کرے اس سے ہمیشہ مطلع و شکرگذار فرمائیں گے۔ والسلام خیر ختام

محمد علی عفی عنہ

سکریٹری انجمن تہذیب الاخلاق بنارس

۱۱ر اکتوبر ۱۹۰۹ء (۴۸)

۲۵۔ علامہ شبلی نے علماء وفضلا، قانون داں، ارباب کمال اور صاحب اثر ورسوخ کے علاوہ مختلف علاقوں کی انجمنوں اور ان کے ذمہ داروں کو بھی خطوط لکھ کر انجمن وقف علی الاولاد کے لئے متحرک کیا۔ انجمن تہذیب الاخلاق بنارس کا ذکر اوپر آچکا ہے، اس سلسلہ کی ایک کڑی انجمن اسلامیہ امرتسر بھی ہے۔ علامہ شبلی نے اس کے ذمہ داروں کو بھی اس تحریک اور اس کے اسباب و مقاصد سے آگاہ کیا تھا۔ انجمن اسلامیہ امرتسر کے اس وقت کے عہدہ دار وذمہ دار کون تھے معلوم نہ ہوسکا۔ تاہم انجمن کی طرف سے جو خط آیا ہے وہ خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ انجمن اسلامیہ امرتسر نے نہ صرف تائید وحمایت کی بلکہ مالی تعاون بھی پیش کیا۔ اس کا خط یہ ہے:

بخدمت جناب شمس العلماء مولانا شبلی صاحب نعمانی

جناب کا عنایت نامہ مورخہ ۲۹ر جنوری ۱۹۰۸ء جو اجلاس انجمن منعقدہ ۲ر فروری ۱۹۰۸ء میں پیش ہوا، انجمن آپ کی شکر گذار ہے کہ آپ نے ایسے ضروری اور اہم مسئلہ کے متعلق تحریک شروع کی ہے۔ انجمن کو آپ کی تحریر کے ساتھ قطعی اتفاق ہے۔ اگر کچھ مشورہ وغیرہ کے طریق سے انجمن سے کچھ دریافت فرمانا ہو تو بیشک تحریر فرمایا کریں۔ انجمن نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اخراجات کے واسطے مبلغ ایک سو روپیہ بطور چندہ بھی دیا جاوے۔ جب آپ تحریر فرماویں گے بھیج دیا جائے گا۔

خادم المسلمین

آنریری سکریٹری انجمن اسلامیہ امرتسر

مورخہ ۴ر فروری ۱۹۰۸ء (۴۹)

۲۶۔ مسلم لیگ مدراس، انجمن تہذیب الاخلاق بنارس اور انجمن اسلامیہ امرتسر کے بعد علامہ شبلی نے انجمن اسلامیہ لاہور کے جنرل سکریٹری کو بھی خط لکھ کر تحریک وقف علی الاولاد سے متعارف کرایا۔ حالانکہ لاہور سے مسٹر محمد شفیع، مسٹر فضل حسین، مسٹر محمد اقبال وغیرہ کو وہ نہ صرف مطلع کر چکے تھے بلکہ ان کی شمولیت اور رضامندی کے خطوط آچکے تھے۔ غالباً علامہ کا یہ خیال رہا ہوگا کہ اگر انجمنوں سے تائید وحمایت حاصل ہوگئی تو انفرادی کے مقابلہ اجتماعی طریقہ زیادہ مفید اور کارگر ثابت ہوگا۔ بہرحال علامہ شبلی نے انجمن اسلامیہ لاہور کے جنرل سکریٹری محمد بشیر علی سے

رابطہ نہیں کیا تو خود انھوں نے پہل کی اور لکھا کہ

مکرم بندہ جناب شمس العلماء مولانا مولوی شبلی نعمانی صاحب زاد الطافکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مجھ کو آنجناب سے بمقام امرتسر، پھر بمقام دہلی شرف نیاز حاصل ہوا تھا اور اس وقت آنجناب سے مسئلہ وقف علی الاولاد کا ذکر بھی آیا تھا۔ درحقیقت آپ نے اس امر میں جو کوششیں فرمائی ہیں، ان سے قوم کو بڑا نفع پہنچنے کی توقع ہے۔ خدا کرے آپ کی کوششیں کامیاب ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ انجمن اسلام پنجاب لاہور میں بھی اس مسئلہ کو پیش کر کے اس کی تائید حاصل کی جاوے۔ اس بات کے واسطے ضرورت ہے کہ آپ نے جو کچھ کارروائی کی ہو اس کے نقول انجمن ہذا کے جلسے میں پیش کرنے کے لئے مرحمت فرمائیں۔ اگر کچھ کارروائی چھپی ہو تو اس کی بھی ایک کاپی بھیج دیں۔ باعث مشکور ہوگا۔

میں ان شاء اللہ تعالی ندوۃ العلماء کے سالانہ جلسے میں شریک ہونے کی کوشش کروں گا اور چند اصحاب کو بھی ہمراہ لاؤں گا۔ خاکسار

محمد بشیر علی

جنرل سکریٹری انجمن اسلامیہ لاہور

۲۶ رفروری ۱۹۱۰ء (۵۰)

مذکورہ بالا انجمنوں اور ان سے وابستہ اشخاص نے انجمن وقف علی الاولاد کے سلسلہ میں کیا خدمات انجام دیں، اس کی تفصیلات دستیاب نہ ہوسکیں۔ ہماری انجمنوں کا مسلم معاشرے کے تحفظ وبقا کے سلسلہ میں بڑا اہم کردار رہا ہے۔ مگر اب نہ وہ انجمنیں باقی رہیں اور نہ ان کی تاریخ۔ اس میدان میں بھی علامہ شبلی کی یہ کاوش یادگار رہے کہ انہوں نے ندوۃ العلماء، انجمن وقف علی الاولاد اور اشاعت اسلام وغیرہ کے سلسلہ میں جو کوششیں اور کاوشیں کیں ان کی روداد بھی سپرد قلم کر کے محفوظ کردی۔ جس طرح پروفیسر اشتیاق احمد ظلی ڈائرکٹر دارالمصنفین شبلی اکیڈمی نے ماہ نامہ الندوہ کی ۹ رجلدیں شائع کر کے علامہ شبلی کی ایک عظیم الشان خدمت کو محفوظ کیا ہے ضرورت ہے

کہ اسی طرح ان کے قلم سے نکلی ہوئی روداد بھی شائع کر کے محفوظ کر دی جائیں۔

۲۷۔ اپنے عہد کی مشہور کتاب ''مغل اور اردو'' کے مصنف، ادیب الملک نصیر حسین خیال [۱۸۸۰-۱۹۳۴ء] کلکتہ نے تحریک وقف علی الاولاد کے سلسلہ میں خود آگے بڑھ کر علامہ شبلی نعمانی کو لکھا کہ

گذشتہ مئی میں مسٹر جسٹس امیر علی نے لندن سے ایک خط میں فقیر کو تحریر فرمایا تھا کہ وہ اس امر میں کوشش کرنا چاہتے ہیں اور مسلمانان ہند متفق ہوں تو وہ اور زیادہ آمادہ ہوں۔ فقیر ہر طرح کی مدد کے لئے حاضر اور کلکتہ بلکہ صوبہ بہار اور بنگال کے متعلق جو خدمت ہمارے سپرد کی جائے گی اس کی انجام دہی اپنا فرض سمجھے گا۔

نصیر حسین خیال

کلکتہ (۵۱)

۲۸۔ تحریک وقف علی الاولاد کے زمانہ میں ملک میں متعدد تحریکیں کام کر رہی تھیں۔ ان میں سب سے نمایاں تحریک علی گڑھ تھی۔ اس وقت اس کے روح رواں نواب وقار الملک [۱۸۴۱-۱۹۱۷ء] تھے۔ انہوں نے بھی انجمن وقف علی الاولاد سے دلچسپی لی اور علامہ شبلی کو لکھا کہ

وقف اولاد کا مسئلہ آل انڈیا مسلم لیگ کی کارروائی کا بہت خوشگوار جز ہے، لیکن ظاہر ہے کہ مختلف اجزا کے لحاظ سے مختلف قابلیتوں کے لوگ ان کے سرانجام دینے کو درکار ہوا کرتے ہیں۔ اگر آپ اس کام کو بدستور اپنے ہاتھ میں رکھیں اور جو مدد آپ کو لیگ سے درکار ہو وہ لیگ سے لیتے رہیں اور آخر کار اس مسئلہ کو لیگ گورنمنٹ میں پیش کرے تو میرے نزدیک نہ صرف مناسب ہوگا بلکہ کامیابی کے لئے بہت مفید۔

مشتاق احمد

۲۷ر جنوری ۱۹۰۸ء (۵۲)

نواب وقار الملک کے اس مشورہ پر اس وقت تو عمل نہیں ہوا۔ البتہ بعد میں اس پر عمل پیرا ہو کر کامیابی ملی۔ طویل جدوجہد کے بعد علامہ شبلی نے ایک وفد ترتیب دیا اور اس کو ساتھ لے کر حکام سے اور کونسل کے اراکین سے ملنے کلکتہ گئے۔ وفد میں کون سے اشخاص شامل تھے، ان کے

ناموں کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ بعد میں علامہ شبلی پریوی کونسل کے اراکین سے تن تنہا کلکتہ جا کر ملے اور انھیں قانون وقف علی الاولاد کی اہمیت سے آگاہ کر کے انہیں حمایت کے لئے راضی کیا۔

۲۹۔ علامہ شبلی نے وقف علی الاولاد وفد میں شمولیت کے لئے علامہ اقبال [۱۸۷۷۔ ۱۹۳۸ء] کو خط لکھا تھا، اس کے جواب میں انھوں نے معذرت کی اور لکھا کہ:

مخدوم ومکرم جناب قبلہ مولوی صاحب............السلام علیکم

آپ کا نوازش نامہ ملا۔ انجمن کا جلسہ ایسٹر کی تعطیلوں میں ہوگا۔ اگر وہاں کی شمولیت کے بعد میں لکھنؤ حاضر ہو سکا تو ضرور حاضر خدمت ہوں گا۔

افسوس ڈیپوٹیشن میں شریک ہونے سے قاصر ہوں۔ اگر آپ کا ارشاد ہو تو چودھری شہاب الدین صاحب بی اے وکیل چیف کورٹ سے دریافت کروں۔ وہ نہایت قابل آدمی ہیں اور اس کام کے لئے اہل۔ اگر یہ پسند نہ ہو تو نواب ذوالفقار علی خان اس وقت کلکتہ میں ہیں، آپ ان کو پنجاب کی طرف سے انتخاب کریں اور ان کو لکھ دیں کہ وہ ۲۹/جنوری تک کلکتہ میں ٹھہریں۔ مسٹر محمد شفیع بیرسٹر لاہور بھی اس وقت کلکتہ میں ہیں۔ غالباً وہ بھی آپ کے لکھنے پر ۲۹/جنوری تک وہاں قیام کرسکیں۔ جو تجویز پسند خاطر ہو اس کو عمل میں لایئے۔ باقی خیریت ہے۔ آپ کا مخلص

محمد اقبال بیرسٹر

لاہور۔۱۲/جنوری ۱۹۱۲ء (۵۳)

وفد کی حکام سے ملاقات کی تاریخ غالباً ۲۹/جنوری ۱۹۱۲ء تھی۔ اس ملاقات کا نتیجہ محض اس قدر نکلا کہ اراکین کونسل بل کی حمایت کے لئے راضی ہو گئے۔

وکلا اور قانون دانوں کے مشورہ سے یہ بل محمد علی جناح نے قانون ساز کونسل میں پیش کیا اور وہ اتفاق رائے سے منظور ہوا۔ انہوں نے یہ بل پیش کرتے ہوئے انجمن وقف علی الاولاد اور اس کی کوششوں کا ذکر کیا۔ علامہ شبلی کی کاوشوں کو سراہا۔ اس طرح یہ تحریک اپنے اختتام کو پہنچی۔ مگر محمد علی جناح کے سوانح نگار انجمن وقف علی الاولاد اور قانون وقف علی الاولاد کی تمام تر کامیابی کا سہرا ان کے سر باندھتے ہیں۔ جو یقینی طور پر غلط رویہ اور تاریخ سازی ہے۔

۴۔ بھوپال کی پیش کش

علامہ شبلی حیدرآباد کے عہدہ نظامت سررشتہ علوم وفنون سے ۱۹۰۵ء میں مستعفی ہوئے تو متعدد احباب واشخاص کی طرف سے ان کے لئے آوازیں بلند ہوئیں۔علامہ اقبال پنجاب لے جانا چاہتے تھے۔نواب محسن الملک [۱۸۳۶-۱۹۰۷ء] علی گڑھ اور والیٔ بھوپال سلطان جہاں بیگم [۱۸۵۸-۱۹۳۰ء] کی خواہش تھی کہ علامہ شبلی بھوپال آجائیں۔ چنانچہ انھوں نے علامہ شبلی کے دوست نواب محسن الملک سے رابطہ قائم کیا اور انھیں بھوپال لانے کی ذمہ داری سونپی۔اس موقع پر نواب محسن الملک نے علامہ شبلی کو لکھا کہ

> مولانا! ہر ہائی نس بیگم صاحبہ نے مجھ سے دریافت کیا ہے کہ مولوی شبلی صاحب یہاں آنا پسند کریں گے یا نہیں؟ اگر آئیں گے تو کیا مشاہرہ قبول کریں گے۔فرمائیے کیا جواب دیا جائے۔
>
> آپ کی طبیعت کیسی ہے۔الندوہ کب نکلے گا۔آپ کے قبضہ میں ندوہ کے آنے سے حضرات علما کا کیا حال ہے۔مدد دیں گے یا فرنٹ ہوجائیں گے۔
>
> مہدی
>
> (۵۴)

حضرات علما اس وقت تو فرنٹ نہیں ہوئے ،البتہ بعد میں اس قدر فرنٹ ہوئے کہ علامہ شبلی کو ندوہ سے مستعفی ہونا پڑا۔گو اس کے بعد دارالعلوم جاری رہا اور آج بھی جاری ہے،تاہم واقعہ یہ ہے کہ تحریک ندوہ اسی دن ختم ہوگئی۔

۵۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء

علامہ شبلی نے حیدرآباد کو خیرباد کہا تو تمام جلوؤں سے نظر بچا کے سیدھے ندوہ آئے،کسی طرف مڑ کے نہیں دیکھا اور اپنی تمام تر صلاحیتیں ندوہ پر لگا دیں۔لیکن ان کی تمام تر کوششوں کے بعد بھی ایک طبقہ ان کا مخالف رہا اور طرح طرح سے اذیتیں دیتا رہا تاہم وہ ڈٹے رہے۔

ا۔ الندوہ کی ادارت

اس سلسلہ کا سب سے پہلا جو واقعہ پیش آیا وہ یہ تھا کہ علامہ شبلی ایک رسالہ جاری کرنا چاہتے تھے کہ تصنیف وتالیف کا کام آگے بڑھایا جا سکے۔ تصنیف وتالیف کے لئے طلبہ کی تربیت کی جا سکے۔ ان کی کوشش وخواہش پر ماہ نامہ الندوہ کا اجراء منظور ہوا۔ مگر چند لوگ ایسے بھی تھے جو یہ نہیں چاہتے تھے کہ الندوہ کے ایڈیٹر علامہ شبلی ہوں۔ چنانچہ ان لوگوں نے مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کو ایڈیٹر مقرر کیا۔ آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ علامہ شبلی کی علمی شخصیت کے ساتھ یہ کس طرح کا بھونڈا مذاق تھا، تاہم کچھ لوگ لگے اور کسی طرح رضامندی کے بعد علامہ شبلی کو بھی ایڈیٹر بنایا گیا۔ اس سلسلہ کا مولانا محمد علی مونگیری [۱۸۶۹ء-۱۹۲۳ء] کا یہ خط واضح کرتا ہے کہ انھیں کیسے ایڈیٹر مقرر کیا گیا۔ وہ لکھتے ہیں۔

> ''جلسہ انتظامیہ میں آپ کی ایڈیٹری اور مولوی حبیب الرحمٰن صاحب کی ایڈیٹری اور مولوی عبدالحی صاحب کی مہتممی طے ہوگئی۔ چنانچہ منشی (احتشام علی کاکوروی) صاحب ہی سے رائے لی گئی، ان کو بجز اقبال کے کوئی چارہ نہ تھا۔ بعد کو باتفاق پاس ہوا۔ اب فقط سرکار سے اجازت طلب کرنا چاہئے۔ میرے نزدیک جلسہ سے قبل اشتہارات شائع ہو جائیں اور جلسہ میں رسالہ تیار ہو کر موجود رہے تو اور بھی بہتر رہے گا۔ ورنہ اشتہار تو ضرور اس وقت تک طبع ہو جائیں''۔ فقط
>
> محمد علی (۵۵)

بہر حال جولائی ۱۹۰۴ء میں ماہنامہ الندوہ بڑی شان سے نکلا اور جب تک علامہ شبلی ندوہ میں رہے اسی شان سے نکلتا رہا۔ اس کی تاریخ ہماری صحافتی تاریخ میں بلند درجہ رکھتی ہے۔ اس سے ملت کو بڑا فائدہ پہنچا۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے حیات شبلی میں اس کے اثرات کی نشاندہی کی ہے۔

علامہ شبلی کی ادارت میں الندوہ کے جو شمارے شائع ہوئے تھے پروفیسر اشتیاق احمد ظلی ڈائرکٹر دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ نے انہیں از سر نو شائع کر کے نئی نسل کو ماہ نامہ الندوہ سے

استفادہ کی راہ ہموار کر دی ہے۔

۲۔ندوہ کی کامیابی

ندوہ جدید نافع اور قدیم صالح کے اصول پر قائم ہوا تھا۔ ابتدائی دور میں تحریک ندوہ سے جولوگ وابستہ ہوئے ان میں کوئی بھی شخص علامہ شبلی سے زیادہ تعلیم، اصول تعلیم، نصاب تعلیم اور جدید وقدیم علوم میں مہارت اور بصیرت نہیں رکھتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ندوہ علامہ شبلی کے معتمد تعلیم مقرر ہونے سے پہلے محض ایک معمولی مدرسہ تھا۔ علامہ شبلی آئے تو شب وروز کی محنت شاقہ سے اسے ملک کے نامور مدرسوں کے مقابل لا کھڑا کیا اور ہر طرف اس کی دھوم مچ گئی۔ مولانا حالی نے جب دارالعلوم ندوہ کی کامیابی دیکھی تو گویا وہ بھی شبلی کی زبان بولنے لگے اور علامہ شبلی کو لکھا کہ

> ''سب سے زیادہ اس بات کی خوشی ہے کہ دارالعلوم نے اپنی تعلیم کا نہایت عمدہ نمونہ پہلی ہی بار پیش کیا ہے۔ فبارک الله فیها و فی طلبتها وفی تعلیمها. مجھے امید نہیں بلکہ یقین ہے کہ عربی کی کامل تعلیم اور انگریزی بقدر ضرورت ہماری قوم میں ایسے لائق مضمون نگار اور مصنف پیدا کرے گی کہ محض انگریزی تعلیم آج تک ویسا ایک بھی نہیں پیدا کر سکی۔''

الطاف حسین حالی

پانی پت۔ مئی ۱۹۰۵ء (۵٦)

۳۔ علامہ شبلی نے ندوہ کی تعلیم اور اس کے مقاصد کا صور اس زور سے پھونکا کہ بڑے بڑے مدارس اور جدید تعلیم کے سب سے بڑے مرکز علی گڑھ کے ہونے کے باوجود لوگوں کی نگاہیں ندوہ پر جا کر ٹھہرنے لگیں۔ ڈارجلنگ میں ایک انجمن قائم ہوئی تو اس کے ذمہ دار نے علامہ شبلی کو لکھا کہ

> ''مسلمانان دارجلنگ نے ایک انجمن بنام انجمن اسلامیہ دارجلنگ مورخہ ۵/ دسمبر ۱۹۰۹ء کو قائم کی ہے۔ .... آپ مہربانی فرما کر اپنی انجمن کے ضوابط وقواعد بذریعہ ڈاک ارسال فرمائیں، تاکہ اس انجمن کے قواعد بھی آپ کے مطابق مقرر کئے

جائیں''۔ جنوری ۱۹۱۰ء(۵۷)

علامہ شبلی نے مذکورہ خط کو نقل کر کے لکھا کہ

یہ ندوۃ العلماء کی ترقی اور مقبولیت کے ابتدائی آثار ہیں، لیکن وہ زمانہ بہت جلد آنے والا ہے جب وہ تمام اسلامی مدارس اور اسلامی انجمنوں کے لئے شمع راہ ہوگا۔(۵۸)

علامہ شبلی کی یہ حسرت پوری ہوئی اور اس سے بڑے بڑے عالم و فاضل پیدا ہوئے مگر بعد میں جب شبلی کی فکر اور ان کے آثار مٹائے گئے تو ندوہ گو اپنی اصل حیثیت میں قائم نہیں رہا۔ تاہم دور اول کو یکسر مٹایا نہیں جا سکا۔

۴۔ ندوہ میں علامہ شبلی کا ایک بڑا عظیم الشان کارنامہ امراء اور رؤسا اور والیان ریاست وحکومت کو ندوہ کی طرف متوجہ کرنا بھی ہے۔ بھوپال، حیدر آباد، بہاول پور کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اگر ندوہ کی صحیح اور مفصل تاریخ لکھی گئی ہوتی تو علامہ شبلی کی یہ خدمات سنہرے حرفوں میں لکھی جاتیں، مگر افسوس کہ سنہرے حرفوں میں کیا بد دیانت اہل قلم سے کالے حرفوں میں بھی نہ لکھی جاسکی۔ المیہ یہ ہے کہ اس سلسلہ میں ایک ایسے شخص نے خیانت سے کام لیا، جس کے تقویٰ و طہارت کی لوگ قسم کھاتے ہیں۔ حق مغفرت کرے۔

اسی سلسلہ کا ایک واقعہ یہ بھی ہے کہ علامہ شبلی نے ریاست کولہاپور کے ہندو راجہ کو ندوہ کی طرف راغب کرنے کے لئے خط لکھا۔ اس کے جواب میں مہاراجہ کولہاپور کے افسر تعلیم کنج لال دیوالی ایم اے نے راجہ کے حکم پر جواب لکھا کہ

''کچھ دن ہوئے مفاخرت نامہ والا شرف صدور لایا تھا۔ موقع پا کر وہ حضور مہاراجہ صاحب دام ملکہ کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ حضور ممدوح اس کا مضمون سن کر بہت مسرور ہوئے اور فرمایا کہ طالب علم کو وہاں روانہ کیا جائے۔ امید ہے کہ یہ نوجوان جناب کے دار العلوم سے اتنا ذخیرہ علوم کا لے کر واپس آئے گا کہ کل گرد و نواح کے مسلمان اس پر فخر کریں گے۔''

کنج لال

افسر تعلیم، ریاست کولہاپور

جون۱۹۰۹ء(۵۹)

مہاراجہ کے حکم سے کولہا پور کے کس طالب علم نے ندوہ میں داخلہ لیااور کب تک تعلیم حاصل کی یہ معلوم نہ ہوسکا۔

علامہ شبلی نے مہاراجہ کولہا پور کے اس اقدام کو''بے تعصبی کی ایک حیرت انگیز مثال سے تعبیر کیا ہے''۔(۶۰)

۵۔علامہ شبلی کی کوششوں سے ریاست بہاول پور کی خاتون حکمراں نے پچاس ہزار روپیہ کی بہت بڑی رقم ندوہ کو نذر کی تھی۔علامہ شبلی نے ماہنامہ الندوہ میں انتہائی خوبصورت انداز میں ان کا شکر یہ ادا کیا ہے۔اس موقع پر علامہ شبلی نے یہ بھی طے کیا تھا کہ ریاست بہاول پور کے جشن چہل سالہ سالگرہ پر ندوہ کا ایک وفد جا کر تہنیت پیش کرے گا۔اس کی اجازت طلب کی گئی تو مدار المہام کے پرسنل اسسٹنٹ نے علامہ شبلی کو جواباً لکھا کہ

''بخدمت معتمد صاحب دفتر ندوۃ العلماء بمقام لکھنؤ

بجواب مراسلہ نشان ۱۴۹۳۔مورخہ ۱۶رشعبان ۱۳۲۳ھ نگارش ہے کہ عالی جناب مدار المہام ارشاد فرماتے ہیں کہ ندوۃ العلما کی جانب سے بتقریب جشن چہل سالہ سالگرہ مبارک، اس قدر مسافت بعیدہ سے کوئی وفد بھیجنے کی زحمت گوارا نہ فرمائی جائے۔اگر مجلس موصوفہ سے صرف تہنیت نامہ بھیج دیا جائے تو کافی ہوگا جو بخوشی تمام بارگاہ خسروی میں گذران دیا جائے گا۔فقط

محمد غوث

پرسنل اسسٹنٹ(۶۱)

چنانچہ محض سپاس نامہ مدار المہام کی خدمت میں پیش کیا گیا۔

۶۔لندن میں مذہب کی صورت حال

علامہ شبلی کو اسلام اور مسلمانوں کے معاملات ومسائل سے ہمیشہ دلچسپی رہی، اسلام یا مسلمانوں پر پوری دنیا میں کہیں بھی افتاد پڑتی تو وہ بے چین ہوجاتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ وہ عالم

اسلام سے پوری طرح باخبر رہتے تھے۔ان کے مضامین، منظومات اورالندوہ کے شذرات اس کی شہادت دیتے ہیں۔مولوی قربان احمد وکیل بارہ بنکی کے فرزندلندن میں زیرتعلیم تھے۔باپ بیٹے دونوں سے علامہ شبلی کے مراسم تھے۔مولوی قربان احمد ندوہ کے خاص معاونین میں تھے۔ان کے صاحب زادے لندن کے حالات لکھ کر اپنے والد کو بھیجا کرتے تھے۔اس سلسلہ کا ایک مفصل خط انھوں نے علامہ شبلی کولکھا تو انھوں نے اسے الندوہ میں شائع کر دیا۔یہ خط کئی لحاظ سے بے حد اہم ہے۔ابن مولوی قربان احمد نے لکھا کہ

''لندن کے مختلف طور پر مختصر احوال میں گھر پر لکھتا رہا ہوں، غالبًا آپ کو بھی معلوم ہوتے رہے ہوں گے۔ایک پہلوان کا باقی ہے جسے میں نے ابھی تک تحریر نہیں کیا، اس کے سننے کے لئے میرے خیال میں آپ زیادہ موزوں ہیں۔ وہ پہلو مذہب ہے۔ یہاں کے لوگ برائے نام عیسائی ہیں۔سو میں دس مشکل سے اتوار کے دن گرجے میں جاتے ہیں اوران دس میں مشکل سے دو بخیال عبادت، اصل مسلک اہالی لندن وانگلستان کا تحصیل دینا ہے،لیکن قابل غور بات یہ ہے کہ جہاں تک میرا تجربہ یہاں کے متعلق ہے، یہاں کے لوگ اپنے مذہب سے خوش اور مطمئن نہیں۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر وہ مذہب بدل کیوں نہیں ڈالتے، اس کے مختلف جواب ہیں۔اولاً ان کو کوئی بہتر مذہب معلوم نہیں۔ یہودیوں سے قلباً متنفر ہیں۔کوئی بت پرستی کا مذہب اختیار کرنا محض عقل کے خلاف ہے۔ رہا اسلام سو مسلمان اتنے کاہل ہیں کہ وہ اتنی بھی فکر نہیں کرتے کہ اپنا مذہب کم ازکم ظاہر تو کریں کہ کیا ہے۔ مجھ سے اکثر انگریزوں سے ملاقات ہوئی اور وہ اچھے خاصے تعلیم یافتہ اور لائق فائق، وہ بے چارے یہ نہیں جانتے کہ اسلام کس جانور کا نام ہے۔ یہ ان کا قصور نہیں یہ بیشک ہمارا قصور ہے۔اس کی جواب دہی ہم لوگوں کو خدا اور اس کے حبیب کے سامنے کرنی ہوگی۔مسلمان جو یہاں آتے ہیں اکثر دہریہ، نام کے مسلمان ان کی مثل یہ ہے:

او خویشتن گم ست کرا رہبری کند

میری نظر میں اگر کچھ کیا تو سید امیر علی جج نے ضرور کیا، لیکن بقول شخصے نقار خانہ میں ایک طوطی کی کون سنتا ہے۔ یہاں تو جب تک نقار خانے کے مقابل توپ خانہ نہ ہو اس وقت تک سماعت میں آنا محال۔ ثانیاً عیسائی مذہب اگر سنبھلا ہوا ہے تو پادریوں کی ذات سے۔ وہ آئے دن اسلام کے اوپر الزامات لگا کر لوگوں کو بھڑکایا کرتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ اگر ایسا نہ کیا تو ایک دن وہ آنے والا ہے کہ عیسائیت پنجۂ اسلام کے نیچے دم توڑ رہی ہوگی، اور آپ جانتے ہیں کہ پادریوں کا زوال عیسائیت میں کس قدر ہوگا۔ اب ان دین دار سچے پادریوں کا جواب دینے والا کوئی نہیں، جو انھوں نے کہہ دیا بس وہی ٹھیک۔ مراکو کے مسلمان بالکل جاہل، ان کو لڑنے بھڑنے سے کہاں فرصت۔ ایران کی قریب یہی کیفیت۔ ترک بھی اسلامی پہلو کو چھوڑے ہوئے ہیں، اگر چہ اسلام کے نام پر جان دینے کو طیار، لیکن حقیقتاً جو اصل میں اس کا سنبھالنا ہے وہ مفقود، الا ماشاء اللہ۔ مصر اور ہندوستان کے مسلمان ایک حالت کے ہیں، اگر چہ اول الذکر کچھ آخر الذکر سے بڑھے ہوئے ہیں لیکن اس میدان میں کوئی قدم رکھنے والا نہیں۔ کوئی ایسا نہیں کہ ان دین دار پادریوں کا جواب لکھے اور ظاہر کرے کہ اسلام کیا ہے اور اس کی نسبت کیا کیا غلط اور فضول خبریں مشہور ہیں۔ میرا خیال جہاں تک ہے وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی طرف سے اگر پادریوں کی نصف بھی کوشش کی جائے تو پچاس ہی سال کے عرصہ میں لندن بجائے عیسائی سلطنت کے اسلامی سلطنت ہو جائے۔ میرے ذہن میں اس کی کئی ترکیبیں ہیں۔ اول قرآن مجید کا ترجمہ انگریزی میں پارہ پارہ مع مختصر تفسیر علی الحاشیہ بہت بڑی تعداد میں مفت میں تقسیم ہو۔ چھوٹے چھوٹے رسالے توحید و رسالت کے متعلق چھاپ کر شائع کئے جائیں۔ ان دین دار پادریوں کا جواب برابر معقول طور پر دیا جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح عمری مختصر صورت میں بڑے پیانے پر شائع کی جائے اور سب سے بڑی بات یہ کہ ایک اعلیٰ پیانے پر یہاں مسجد بنائی جائے۔ بہر حال یہ ترکیبیں ہیں جس سے اسلام کی فتح مبین ہو سکتی ہے۔ سب سے بڑا سوال

اور اہم سوال یہ ہے کہ کون کرے۔ جس قدر ہم اپنے اور اپنے بھائیوں میں غور کرتے ہیں بڑا عیب یہی پاتے ہیں کہ یہ خیال کر کے کہ یہ کام بہت بڑا ہے، ہم سے تنہا نہیں ہوسکتا چھوڑ دیتے ہیں اور کسی اور سے اظہار تک نہیں کرتے، ممکن ہے کہ اگر میں زید سے اظہار کروں اور وہ عمرو سے اور اسی طرح وہ کسی اور سے۔ اخیر میں ایک مجموعی طاقت ہو کر اس مشکل کو آسان کر دے۔ میرا خیال یہ ہو رہا ہے کہ مسجد کے لئے یہاں ایک کمیٹی قائم کی جائے اور اس کی شاخیں تمام اسلامی دنیا میں ہوں اور اس کے سر پرست نظام دکن، خدیو مصر، محمد خامس سلطان ترکی اور اڈورڈ ہفتم شاہ انگلستان بنائے جائیں، اور آدمیوں سے تذکرہ کرنے سے معلوم ہوا کہ پچاس ہزار پاؤنڈ کی ضرورت ہوگی، یعنی ۷۵۰۰۰۰۰/ کی لاگت سے ایسی مسجد طیار ہوگی جو مسجد کا کام بھی دے گی اور شوکت اسلام ظاہر کر کے خود داعی الی الاسلام ہوگی۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک آدمی کا کام نہیں، لیکن ابتدا کے بعد خدا خود اپنا کام اپنے کسی نہ کسی بندہ سے چلاتا ہی رہتا ہے۔ مجھے یہاں کے اہل الرائے سے ملنا ہے، مل کر ان سے صلاح مشورے کروں گا۔ اگر ان شاء اللہ ٹھیک ہوا تو ایک کمیٹی قائم کروں گا۔ قریب قریب آدھا روپیہ جو انگلستان کے لوگ محض اپنے نام کے لئے دیں گے اور ان کا روپیہ لینے میں کوئی حرج نہیں۔ کیوں کہ مسلمان کروڑوں روپیہ ان کے گرجے کے لئے دے چکے ہیں تو اگر ہم اپنا قرضہ وصول کر لیں گے تو کوئی حرج نہ ہوگا۔ اور نہ اس میں غالباً ہمارے کسی عالم کو اعتراض ہوگا۔ اگرچہ مسلمانوں پر خفیف سا دھبہ ضرور آتا ہے۔ پہلے دونوں کی نسبت میرا خیال یہ ہے کہ ندوہ کچھ دنوں میں مدد کر سکے گا۔ یہاں آ کر معلوم ہوتا ہے کہ علماء کے انگریزی نہ جاننے کی وجہ سے اسلام کو کس قدر تکلیف اٹھانی پڑ رہی ہے۔ جو کچھ لکھ سکتے ہیں وہ زبان نہیں جانتے۔ جو زبان جانتے ہیں وہ لکھ نہیں سکتے۔ افسوس، سب سے زیادہ افسوس یہ ہے کہ جن میں دونوں باتیں ہیں ان کو ان کے بھائیوں سے کسی مدد کی امید نہیں۔ ایک چنا بھاڑ نہیں پھوڑ سکتا۔ ید اللہ علی الجماعۃ۔ (۶۲)

(ابن قربان احمد)

لندن

ظاہر ہے لندن سے لکھا گیا یہ خط بے حد متاثر کرنے والا تھا اور علامہ شبلی جیسے ذکی الحس کے لئے یہ کسی تازیانہ سے کم نہ تھا۔ چنانچہ انھوں نے اس خط کو نہ صرف بڑے اہتمام سے الندوہ (۶۳) میں شائع کیا بلکہ ایک بار پھر ان کا نظریہ تعلیم زبان پر آ گیا اور انھوں نے علی گڑھ پر چوٹ کرتے ہوئے لکھا کہ

''ہمارے عزیز نے یہ سب سچ لکھا ہے لیکن یہ کس کا قصور ہے؟ ان لوگوں کا جنھوں نے قوم کی تمام ہمت، تمام جوش، تمام محنت، تمام زر و مال کو صرف اس تعلیم کے حاصل کرنے میں لگا رہا ہے جس سے کچھ نوکریاں مل سکتی ہیں۔ ان لوگوں کی بلند آہنگی اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ کوئی دوسری آواز قوم کی کان تک نہیں پہنچ سکتی۔ دین کا کیا ذکر ہے یہ لوگ دنیا کے کاموں کو بھی نہ خود سمجھے نہ سمجھنے دیتے۔'' (۶۴)

مکتوب نگار علامہ شبلی کے ایک شناسا مولوی قربان احمد وکیل بارہ بنکی کے صاحبزادے تھے۔ ان کے بارے میں کسی قسم کی معلومات دستیاب نہ ہو سکیں، حتیٰ کہ ان کا نام بھی معلوم نہ ہو سکا۔

۶۔ دارالعلوم حیدرآباد کا نصاب تعلیم

تعلیم پر گہری نظر ہونے کی وجہ سے ہندوستان کے مشاہیر کی نظریں علامہ شبلی کی طرف اٹھتی تھیں اور یہ بھی واقعہ ہے کہ وہ دلچسپی لے کر ان تعلیمی کاموں کو انجام بھی دیتے تھے۔ ریاست بھوپال اور حیدرآباد کے دارالعلوم اور بعض دیگر تعلیمی اداروں کے نصاب تعلیم و تربیت کے متعلق ان کی کاوشوں کا ذکر حیات شبلی میں تفصیل سے درج ہوا ہے۔ دارالعلوم حیدرآباد جو بعد میں جامعہ عثمانیہ ہوا اس کا الحاق پنجاب یونیورسٹی سے تھا۔ جب یہ تعلق منقطع ہوا اور جدید ضروریات درپیش ہوئیں تو اہل نظر کی نظر انتخاب علامہ شبلی ہی پر جا کر ٹھہری۔ چنانچہ نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی نے انھیں لکھا کہ

''اس وقت باعث تصدیع یہ امر ہوا کہ میں نے اس حادثہ (حادثہ پا) کے چند ہی روز

پہلے سرکار میں یہ تجویز پیش کی تھی کہ چونکہ ہمارے دار العلوم کا تعلق اب پنجاب یونیورسٹی سے منقطع ہوگیا ہے، پس مناسب ہوگا کہ ہم اپنے لئے خود ہی مناسب انتظام کریں۔ یعنی عربی و فارسی نصاب تعلیم مرتب کرنے کی غرض سے ایک کمیٹی جلد مقرر کی جائے، جس میں ایک رکن آپ ہوں اور نصاب تعلیم زمانہ حال کی ضرورتوں کے لحاظ سے مرتب ہو، تا کہ جو لوگ اس مدرسہ میں تعلیم پا کر امتحانوں میں کامیابی حاصل کریں وہ سرکاری خدمات ادا کرنے کے اہل پائے جائیں۔

اس امر کے اطلاع دینے سے میرا یہ منشا نہیں کہ آپ سے فوراً تکلیف گوارا کرنے کی خواہش کروں، بلکہ محض اس قدر اطمینان حاصل کرنا منظور ہے کہ کامل صحت کے بعد آیا یہ امر ممکن ہوگا کہ آپ یہاں تشریف لائیں۔ ایسے قومی کاموں میں آپ ہمیشہ تکلیف گوارا کرتے رہے ہیں۔ اگر آپ کا تشریف لانا ممکن نہ ہو تو کیا آپ نصاب تعلیم پنجاب یونیورسٹی پر نظر غائر ڈال کر ایک جدید نصاب وہیں مرتب فرما سکتے ہیں۔ ترمیم نصاب میں چند ابواب مد نظر رہیں تو بہتر ہے۔

١۔ اصلاح نصاب موجودہ پنجاب یونیورسٹی بہ لحاظ مقتضائے وقت و زمانہ و ضرورات خدمات حکومتی۔

٢۔ تکمیل تحصیل علوم شرقیہ

مددوم کی ضرورت اس وجہ سے ہے کہ پنجاب کی اورینٹل تعلیم ناقص ہے۔ بہت سے علوم جن سے تکمیل فضیلت کی ہوتی ہے، اس تعلیم میں متروک ہیں، اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جماعت مولوی فاضل سے بالا تر اقل مرتبہ دو جماعتیں ہوں، جن میں تحصیل کی تکمیل ہو سکے۔ میری رائے ناقص میں اگرچہ سلسلہ نظامیہ کی پابندی ضروری نہیں ہے مگر تکمیل تحصیل کے لئے بہت کچھ اضافہ کتب درسیہ کی ضرورت ہے۔

سید حسین

حیدر آباد دکن

فروری ١٩٠٨ء (٦٥)

نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی کا یہ خط خود علامہ شبلی نے ماہنامہ الندوہ میں شائع کیا ہے اور اخیر میں لکھا ہے کہ

''نواب صاحب موصوف کا یہ خط اس وقت پہنچا جب مجھ پر پاؤں کے زخمی ہونے کا واقعہ گذر چکا تھا اور میں صاحب فراش تھا۔ جب اس سے صحت ہوئی تو مولوی عزیز مرزا صاحب ہوم سکریٹری حیدر آباد نے نواب عماد الملک بہادر کی تحریر کی بنا پر مجھ کو پھر طلب کیا اور میں جون ۱۹۰۸ء میں حیدر آباد گیا۔ وہاں چند روز رہ کر ایک نصاب طیار کیا اور اس کے متعلق ایک یادداشت لکھی۔ جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ نصاب کن اصول پر طیار کیا گیا ہے۔'' (٦٦)

اس کے بعد وہ یادداشت نقل کی گئی ہے۔ یہ یادداشت آج بھی نصاب تعلیم تیار کرنے والوں کے لئے ایک لائحہ عمل بلکہ ایک بہترین اصول کا درجہ رکھتی ہے۔

۷۔ سنہ شمسی ہجری

آج ہمارے درمیان کئی تقویم سنہ ہجری وعیسوی موجود ہیں، لیکن سو برس پہلے عہد شبلی میں یہ صورت حال نہ تھی۔ علامہ شبلی نے لکھا ہے کہ:

''تمام ممالک اسلامیہ میں اہل علم کوشش کر رہے ہیں کہ دنیاوی ضروریات کے لئے سنہ ہجری کو شمسی حساب میں ہی منتقل کیا جائے۔ مصر اور قسطنطنیہ میں اس کے متعلق خاص کوششیں ہوئی ہیں اور وہاں حکومت میں سنہ ہجری شمسی کا اجراء بھی ہوگیا۔ ہندوستان میں بھی اس کے متعلق کوششیں ہوئی ہیں، مگر ناتمام۔'' (٦٧)

چنانچہ جب مولوی محمد یوسف الدین خاں صوبہ دار ریاست حیدر آباد دکن نے ایک تقویم سنہ ہجری شمسی مرتب کی اور اس کا ایک حصہ ماہنامہ الندوہ میں بغرض اشاعت بھیجا اور اس کی اشاعت کے لئے علامہ شبلی سے درخواست کی۔ چنانچہ انھوں نے جو خط لکھا تھا اسے علامہ شبلی نے قارئین الندوہ کی معلومات کے لئے شائع کیا ہے۔ اس خط کا اقتباس حسب ذیل ہے:

۱۔ شاید آپ کو اس کا علم ہو کہ سنہ شمسی ہجری کی ایک مکمل تقویم مرتب ہو چکی ہے، جو

۱۶؍جلدوں میں ہے۔ اس کا آغاز ۱۰۰ھ قبل الہجرت سے ہے اور ۱۶۰۰ ہجری تک اس کو پہنچایا ہے۔

۲۔ اس میں علاوہ اس کے کہ مشہور قمری، شمسی، عیسوی میں تطابق دیا گیا ہے۔ ایک کام یہ بھی کیا گیا ہے کہ جس سال، جس تاریخ میں دنیا کا جو اہم واقعہ پیش آیا ہے تا امکان اس کو اس تاریخ کے مقابل لکھ دیا ہے۔ جو واقعات اسلام سے زیادہ تعلق رکھتے ہیں ان کی تنقیح وتنقید میں خصوصیت کے ساتھ اہتمام کیا گیا ہے۔

۳۔ سنہ شمسی ہجری ۸؍ربیع الاول روز دوشنبہ (مطابق ۲۰؍ستمبر ۶۲۲ء) سے شروع ہوتا ہے۔ اس کے پہلے دن کا پہلا واقعہ خود ہجرت مقدسہ ہے اور دوسرا صوم عاشورا۔ صوم عاشورا پر اختلاف علماء کی وجہ سے ایک بسیط بحث کی گئی ہے۔

۴۔ میں اپنی کسی رائے کو جو کسی مذہبی واقعہ یا مسئلہ میں رائے عام کے خلاف ہو اس وجہ سے زیادہ وقعت دینا نہیں چاہتا کہ اگر اس کا یقین نہیں ہو تو احتمال ہے کہ شاید کسی اور ذی علم کے علم میں رفع اختلاف کا کوئی دوسرا پہلو بھی موجود ہو۔

۵۔ فرنگی محل ہمیشہ سے علم کا ٹکسال رہا ہے۔ جہاں علم کے کھرے کھوٹے مسائل قابل اطمینان پرکھے جاسکتے ہیں۔ میں یہ چاہتا تھا کہ ایسے اختلافی مضامین کو چن چن کے اس ٹکسال میں روانہ کروں۔ ایسا کیا جاتا تو بھی وہ رائے ایک ہی محلّہ میں محدود ہوتی، الندوہ تمام ہندوستان میں اسلامی دربار کا نقیب ہے۔ وہ میری التجا کو ان فضلا تک بھی بآسانی پہنچا سکتا ہے جو چار دانگ ہندوستان کے ہر گوشہ میں رہتے ہیں۔ اس غرض سے میں اس مضمون کی ایک نقل (جو صوم عاشورا کے متعلق ہے) آپ کی خدمت میں روانہ کرتا ہوں۔ اگر وہ اس قابل بھی ہو تو آپ اس کو الندوہ کے کسی گوشہ میں جگہ دے سکتے ہیں۔

۶۔ اس کی تشہیر سے میرا مقصد اس کے سوا نہیں ہے کہ اہل تحقیق کو اس مضمون کے جس جز میں اختلاف ہو بے تکلف اس کا اظہار فرمائیں، تاکہ ہر پہلو سے اس مضمون پر بحث مکمل ہو جائے اور مجھے اپنی رائے کی نسبت پورا اطمینان حاصل ہو۔ آپ اگر اس

مضمون کو چھاپیں تو اس کے ساتھ اس چٹھی کو بھی چھاپ دیجئے۔

۷۔ اس تقویم میں میرے تمام مباحث فارسی زبان میں ہیں۔اسی وجہ سے یہ مضمون بھی فارسی میں ہے۔اس کو اردو زبان میں اس خیال سے نہیں اتارا ہے کہ ترجمہ میں بے ضرورت وقت صرف ہوگا۔ ہر کاروباری آدمی اپنے وقت کو بچانا چاہتا ہے۔اگر ایک ہی دو مضمون ہوتے تو میں ایسا بھی کرتا۔ چونکہ ایسے مضامین زیادہ ہیں، ہمت پیچھے ہٹ رہی ہے۔اگر اس کا ترجمہ اردو زبان میں ناگزیر ہو تو یہ زحمت بھی ناگزیر اٹھائی جاسکتی ہے۔

۸۔ یہ ضرور نہیں کہ جو اختلاف اس مضمون پر تحریر کیا جاوے وہ بھی فارسی زبان میں ہو۔

فقط آپ کا مخلص

محمد یوسف الدین (۶۸)

۸۔ جرجی زیدان کی ابلہ فریبیاں

عیسائی مورخ، ایڈیٹر الہلال مصر جرجی زیدان [۱۸۶۱-۱۹۱۴ء] نے مسلمانوں بالخصوص عرب مسلمانوں کو بڑا فریب دیا اور اپنی کتاب ''تاریخ التمدن الاسلامی'' میں اسلام اور مسلمانوں پر متعدد الزامات اس طرح عائد کئے کہ اس کے دام میں مسلمان آ گئے۔اس نے اولاً اپنے تاریخی ناولوں میں در پردہ مسلمانوں کی بیخ کنی کی۔ پھر تمدن اسلام کے نام پر تاریخ التمدن الاسلامی میں ان کی تضحیک کی۔اس کی ابلہ فریبیوں کا اولاً علامہ شبلی کو احساس ہوا اور انھوں نے اسے ایک خط لکھ کر علمی خیانت سے باز رہنے کی تلقین کی۔ تاہم وہ باز نہ آیا۔اس کی کتاب کا تنقیدی جائزہ کسی قدر تفصیل سے ہم نے اپنی کتاب '' آثار شبلی'' میں الانتقاد کے ضمن میں ذکر کیا ہے۔اور اس کی فریب کاری کی مثالیں بھی دی ہیں۔

جس وقت وہ تاریخ التمدن الاسلامی لکھ رہا تھا اس نے اعتراف کیا ہے کہ مجھے مسلمانوں کی تہذیب وتمدن کے واقعات کا سراغ علامہ شبلی کی اردو تصنیف رسائل شبلی سے ملا۔

تاریخ التمدن الاسلامی کے زمانہ تصنیف میں ایک مسلمان مورخ ڈاکٹر محمود لبیب بھی اسی

موضوع پر جرمنی میں کام کر رہے تھے۔ انھوں نے اس سلسلہ میں علامہ شبلی سے رابطہ قائم کیا۔ علامہ شبلی نے ان کے جواب میں جرجی زیدان کی ابلہ فریبیوں کا ذکر کیا تو انھوں نے علامہ شبلی کے خط کو اپنے ایک خط کے ساتھ جرجی زیدان کے پاس بھیج کر اس کو اس کی غلط کاریوں کا احساس دلایا اور علامہ شبلی کو ایک مفصل خط لکھا۔ یہ خط جانشین شبلی مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنے ایک مضمون جو الندوہ اکتوبر ۱۹۰۸ء میں جرجی زیدان کے رد میں شائع ہوا نقل کیا ہے۔ یہ خط کسی تحقیقی مقالہ سے کم نہیں۔ وہ لکھتے ہیں۔

حضرۃ العلامہ الفاضل.................السلام علیکم

آپ کا گرامی نامہ مرقومہ ۱۹؍ جولائی (۱۹۰۸ء) ملا۔ آپ کے اس احسان کا میں دل سے مشکور ہوں۔ آپ کا رقعہ میں نے اپنے ایک خط کے ساتھ ایڈیٹر الہلال کے پاس بھیج دیا، امید ہے کہ کتاب اس رقعہ کے ذریعہ وہ بہت جلد بھیج دیں گے۔ آپ نے میرے دل کی بات کہی۔ بیشک اس کتاب میں بہت سا افترا اور ابلہ فریبیاں ہیں اور اس کتاب کی تصنیف سے جرجی زیدان کا اہم مقصد عربوں کی تحقیر اور عجمیوں کی ترجیح ہے۔

جناب من! مصر میں شامی (عیسائی) اہل قلم کی ایک جماعت ہے جس کو تصنیف و تالیف میں ایک اچھی قدرت حاصل ہے۔ اس نے امریکا اور انگلستان کی آغوش میں تربیت پائی ہے اور مشنری کوششوں سے اس نے تعصب اور عداوت کی تعلیم پائی ہے۔ اس کو مشرق اور اہل مشرق سے سخت عداوت ہے اور عجیب وغریب کوششوں سے وہ اس فاسد مادہ کو پھیلانے کی کوشش کرتی ہے۔ ان شامی اہل قلم میں دو گروہ ہیں، ایک کا مقصد بالکل سیاسی ہے۔ اس جماعت کے سب سے پر جوش ارکان اخبار المعظم اور رسالہ المقتطف کے ایڈیٹر فارس نمر، صروف، شاہین مکاریوس ہیں۔ غالباً آپ نے ان اخباروں کا کوئی نمبر پڑھا ہوگا۔ دوسری جماعت وہ ہے جس کی کوشش صرف یہ ہے کہ تاریخ کی تالیف و تدلیس سے بزرگان اسلام کے کارنامے مٹا دیئے جائیں اور اسلامی تاریخ کی غلط تصویر اس حسن و لطافت کے ساتھ کھینچی جائے کہ سادہ

لوح مسلمان محو حیرت ہو جائیں۔ اس جماعت کے سب سے سرگرم رکن جرجی زیدان ایڈیٹر الہلال، ایڈیٹر الشرق اور ایڈیٹر المشرق وغیرہ ہیں۔

میں نے تمدن اسلامی کا نہایت غور وفکر کے ساتھ مطالعہ کیا ہے۔ اس کتاب کا نام التمدن الاسلامی کے بجائے برباد کنندہ تمدن اسلامی ہوتا تو بہتر تھا۔ میں جا بجا اس کی غلطیوں کی یادداشت بھی لکھتا جاتا تھا جو اب تک غیر مرتب اور ناصاف ہے۔ آپ کے خط سے پھر دوبارہ توجہ ہوئی اور پہلا خیال پھر تازہ ہو گیا اور اب میں نے عزم کر لیا ہے کہ اس کو مرتب کر کے چھپوا دوں۔ مبادلہ خیالات کے لئے مناسب ہے کہ آپ کے سامنے بھی اس یادداشت کی چند مثالیں پیش کروں۔

۱۔ منصور نے ابومسلم کو فریب اور دھوکے سے مروا ڈالا (آخر تک پڑھو)، ج ا ص ۷۰ پر ایک صفحہ کے بعد ج ا ص ۷۱ میں اس کا اعادہ کیا گیا کہ منصور نے ابومسلم کو قتل کر ڈالا۔ پھر ج ۲ ص ۱۷۴، اور جلد ۴ ص ۱۱۳/اور ۱۱۶/ پر اس کو بار بار دہرایا۔ ایک ایک بات کو پانچ پانچ مرتبہ دہرا کر لکھنے کی کیا ضرورت تھی۔ کیا اس سے یہ نتیجہ مستنبط نہیں ہوتا کہ مصنف کا مقصود یہ ہے کہ ناظرین کتاب کے ذہن میں یہ خیال بیٹھا دے کہ خلیفہ منصور سخت سفاک، غدار اور محسن کش تھا کہ اس نے ابومسلم جیسے شخص کو مروا ڈالا۔ حالانکہ عباسیوں پر ابومسلم کا یہ کتنا بڑا احسان تھا کہ اس نے اپنی کوشش سے عباسی سلطنت قائم کر دی۔ اب جو شخص تاریخ سے واقف نہیں ہے اور اس کو ان پولیٹکل مصالح سے واقفیت نہیں ہے جن کی بنا پر منصور پر فرض تھا کہ وہ ابومسلم کے قتل سے عباسی سلطنت کو ایک خطرہ عظیم سے بچالے۔ وہ پچھلے صفحات میں ابومسلم کے فضائل اور کارناموں کو پڑھ کر جب یہاں پہنچے گا تو وہ فوراً کہہ دے گا کہ عباسی سلطنت کا پہلا تاجدار ابوجعفر منصور سخت ظالم اور سفاک تھا۔

۲۔ ج ا ص ۱۲۰، ج ا ص ۱۱، ج ۲ ص ۱۲۸، ج ۴ ص ۳۹، ۶۲، ۷۴، ج ۵ ص ۸۴، حضرت عمر بن خطاب نے ان کو کاشت کاری سے روک دیا۔ صرف ایک بات کو جرجی زیدان نے آٹھ مرتبہ کہا۔ اس سے صرف یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ حضرت عمرؓ

سخت وحشی، جاہل اور دشمن تمدن تھے۔

۳۔ ج ۴ص ۱۲۱ میں یہ باب قائم کیا ہے کہ سلطنت عباسیہ میں ذمیوں کی کیا حالت تھی، مگر چن چن کر وہ واقعات لکھے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلمان سخت بے رحم، ظالم، دشمن حریت تھے۔ عنوان تو قائم کیا ہے کہ سلطنت عباسیہ میں ذمیوں کی کیا حالت تھی اور اس میں لکھتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے ذمیوں کو سخت تنگ کر رکھا تھا۔ ان کے کلیسے اور معابد منہدم کرائے۔ ان کو نئے گرجوں کے بنانے کی ممانعت کر دی۔ متوکل عیسائیوں کا دشمن تھا۔ اس نے ان کے کلیسے ڈھہوا دیئے۔ عیسائیوں کو حکم دیا کہ اپنے دروازوں پر شیطان کی صورتیں بنائیں۔ ان کو سرکاری نوکریوں سے علاحدہ کر دیا۔ وہ صلیب نہ نکالنے پائیں اور بہت سے احکام ان کی تحقیر کے لئے جاری کئے۔ ان احکام کو تفصیل سے لکھ کر دبی زبان میں کہتا ہے کہ پہلے عیسائیوں ہی کی شرارت تھی۔ اسی قسم کے بیسیوں واقعات لکھے ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں سخت مذہبی تعصب تھا۔

۴۔ ج ۴ص ۹۲، میں لکھتا ہے کہ مسلمانوں کے عہد میں ذمیوں کو مرنے کے بعد دفن ہونے کی اجازت نہ تھی۔ جب تک کہ محکمۂ شرع سے دفن کا اجازت نامہ نہ حاصل کر لیا جائے، اس قسم کا ایک اجازت نامہ جو دیار بکر کے ایک عیسائی کو ملا تھا۔ جرجی زیدان لکھتا ہے کہ مجھ کو اپنے ایک معتبر دوست سے ملا ہے اور میرے ایک دوست نے بیان کیا کہ اس قسم کے بہت سے اجازت نامے مصر کے کلیسوں میں محفوظ ہیں۔ دیار بکر کے اجازت نامہ کی عبارت یہ ہے:

از جانب شرع شریف دیار بکر بسر اور کفارائے کر یہ منظر اور اے وہ جس کا خیال ہے کہ یعقوب کافر ہمارے مکروہ گروہ میں داخل تھا۔ چونکہ وہ ملعون مر گیا ہے، اس لئے اس کے ناپاک بدن کو زمین میں رکھنے کے لئے حاکم شہر سے رحم صادر ہوا۔ اگرچہ زمین اس کی ناپاک لاش کو قبول نہ کرے گی، لیکن چونکہ تعفن پیدا ہونے کا خوف ہے اس لئے شرع شریف کی طرف سے ہم اجازت دیتے ہیں کہ وہ خاص تمہارے شہر

میں تمہارے باطل مذہب کے مطابق جہنم میں جھونک دیا جائے۔ یہ اجازت نامہ اس لئے عطا کیا گیا تا کہ دفن کرنے میں روک نہ سکے۔

کہاں اس عبارت کو شائع کرنا جو سراسر جھوٹ اور لغو ہے، مصنف تمدن اسلام کا تعصب ہے اور یہ کس قدر جھوٹ ہے کہ مصر میں اس قسم کے بہت سے اجازت نامے موجود ہیں۔

۵۔ ج ۵ ص ۲۷، میں الخصیان کا عنوان قائم کیا ہے، جس میں لکھا ہے کہ اندلس میں خواجہ سراؤں کی تجارت یہود کرتے تھے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کے خواجہ سراؤں کی تجارت خود عیسائی کرتے تھے اور عام طور سے عیسائی ان غلاموں کو ایشیائے کوچک کے راستہ سے دمشق لاتے تھے۔ اس قسم کی تجارت عیسائیوں میں گذشتہ صدی تک موجود تھی۔

۶۔ ج ۵ ص ۸۰، میں لکھا ہے کہ عرب جن میں قریش بھی داخل ہیں عام طور سے ٹڈی، کھوئے، بچھو اور کیڑے مکوڑے حشرات الارض کھاتے تھے! ہم جہاں تک خیال کرتے ہیں جرجی زیدان کے پاس اس غلط ادعا کی کوئی تاریخی دلیل موجود نہیں ہے۔

محمود لبیب

برلن۔ ۴/ اگست ۱۹۰۸ء (۶۹)

مولانا سید سلیمان ندوی [۱۸۸۴-۱۹۵۳ء] نے پورا خط نقل نہیں کیا ہے۔ لیکن اب یہ معلوم نہیں کہ وہ خط کہاں محفوظ ہے۔ البتہ سید صاحب نے اسے اپنے مضمون میں نقل کر کے علمی دنیا پر احسان کیا ہے کہ ان کی بدولت یہ خط آج ہماری نظروں کے سامنے ہے۔ اس خط میں اور بھی مباحث تھے، جیسا کہ سید صاحب کی اس تحریر سے واضح ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

> ''ڈاکٹر محمود نے اس پر بہت زور دیا ہے اور خود تمدن اسلام کی مختلف عبارتوں سے ثابت کیا ہے کہ جرجی زیدان نے مصر کے باشندوں کی تعداد اور خراج کی مقدار جو بتائی ہے وہ بالکل غلط ہے اور آپس میں متناقض ہے اور اس کے لکھنے سے جرجی زیدان کی صرف غرض یہ تھی کہ دیکھو مسلمان اس قدر ظالم اور وحشی وغیر مہذب تھے اور

یہ کہ انھوں نے مصر کو ہر طرح سے تباہ و برباد کر رکھا تھا۔'' (۷۰)

آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ان الزامات نے علامہ شبلی کو کس قدر برافروختہ کیا ہوگا۔ چنانچہ انھوں نے جرجی زیدان کا بڑے محققانہ انداز میں رد لکھا۔ اس کا نام الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی ہے۔ علامہ شبلی نے ۱۹۱۲ء میں اسے ہندوستان اور مصر سے ایک ساتھ شائع کرایا۔ اب اس کا ایک محقق ایڈیشن ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی کی تحقیق و مراجعت سے دارالمصنّفین نے شائع کیا ہے۔ حال ہی میں وہ بیروت سے بھی شائع ہوا ہے۔ اس کا تفصیلی مطالعہ راقم کی کتاب آثار شبلی میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

۹۔ الانتقاد اور علمائے مصر

''الانتقاد'' کی اطلاع جب مصر پہنچی تو علامہ سید رشید رضا مصری [۱۸۶۵-۱۹۳۵ء] نے علامہ شبلی کو خط لکھ کر ان کا شکریہ ادا کیا اور لکھا کہ

> ''میں خاص طور پر آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے جرجی زیدان کی کتاب کا رد لکھا۔ اگر مجھ کو فرصت ملتی جیسی کہ آپ کو خدا نے دی ہے تو میں آپ سے پہلے اس عظیم الشان خدمت کو انجام دیتا۔ میں نے مصر کے بعض اساتذہ کو اس کی ترغیب دی تھی، لیکن ان لوگوں نے کاہلی کی۔ میں آپ کے رسالہ کو المنار میں چھاپوں گا۔''
>
> رشید رضا
>
> جنوری ۱۹۱۲ء (۷۱)

علامہ شبلی نعمانی نے ''الانتقاد'' کی اشاعت سے پہلے جرجی زیدان کی کتاب پر ماہ نامہ الندوہ میں ایک محققانہ تبصرہ کیا۔ وہ تبصرہ جب جرجی زیدان کی نظر سے گذرا تو اس نے علامہ شبلی کو خط لکھا کہ

> **جناب شیخ شبلی النعمانی**
>
> میری نگاہ سے ندوۃ العلماء کے مجلّہ میں آپ کا ہندوستانی زبان کا مقالہ گذرا۔ ....دروغ گوئی، خیانت، دسیسہ کاری وغیرہ الفاظ اس تنقید میں نظر آئے جن کا

شیخ شبلی نعمانی ہندوستان کے سب سے بڑے عالم سے صدور شایان شان نہیں ہے۔ یہ آپ کے علمی مقام بزرگی اور مرتبہ ومقام کے علاوہ ہمارے آپسی تعلقات کے بھی برخلاف ہے۔ہم نے جیسا کہ آپ نے اعتراف کیا ہے۔آپ کا ذکر عظمت واحترام سے کیا ہے۔کیا آپ سمجھتے ہیں کہ یہ لب ولہجہ اس تنقید میں آپ کے دلائل کو طاقتور بنادے گا۔ یہ تنقید تار عنکبوت سے زیادہ کمزور اور باہم متناقض ہے۔قاری کے سامنے اس کی کمزوری واضح ہوجائے گی۔اگر اس کے اندر قباحت نہ ہوتی اور یہ تنقید طعن وطنز سے خالی ہوتی جیسی کہ ہم کو آپ سے امید تھی تو آپ سے بحث وگفتگو کرتے اور بہ دلائل آپ کی غلطیاں واضح کرتے۔ہم نے اس قسم کے طعن وتشنیع پر خاموش رہنے کا فیصلہ کیا ہے اور قارئین پر فیصلہ چھوڑتے ہیں۔میں نے صرف اپنے دکھ کے اظہار کے لئے یہ خط لکھا ہے۔............میرا گمان غالب ہے کہ آپ بعض غرض منداور دفاع عرب کے نام پر لقمہ توڑنے والوں کے ورغلانے میں آگئے ہیں اور اس بنا پر آپ نے اپنی تنقید کی بنیاد عرب کے طعن کے جواب میں اتہامی بنائی جو ایک سیاسی مقصد ہے۔............ یہ کتاب تو دس برس سے شائع ہورہی ہے اور پانچوں براعظم میں پھیل چکی ہے اور پانچ زبانوں میں اس کے ترجمے شائع ہوئے ہیں۔آخر عثمانی سیاست کے اختلاف کے ظہور کے بعد جو عربوں اور ترکوں کے مابین ہوئے یہ تنقید کیوں منظر عام پر آئی۔''(۴۷)

جرجی زیدان کا یہ خط نامکمل ہے۔اس کا درمیان اور آخر کا حصہ ضائع ہوگیا ہے۔علامہ شبلی نے اپنے ایک خط میں لکھا ہے کہ جرجی زیدان نے اپنی تنقید سے دست بردار ہوجانے کے لئے ان کو ایک خط لکھا تھا۔غالبًا یہ وہی خط ہے۔بہر حال علامہ شبلی نے جرجی زیدان کی ایک نہیں سنی اور اپنی کتاب کو بیک وقت ہندوستان اور مصر دونوں مقامات سے شائع کرایا۔لیکن جرجی زیدان سے جو ضرر مسلمانوں کو پہنچنا تھا وہ پہنچ چکا تھا۔واقعہ یہ ہے کہ''الانتقاد'' کا جس پیمانہ پر استقبال ہونا چاہئے تھا وہ نہیں ہوا۔اس کا دوسرا ایڈیشن مولانا محمد عارف عمری کی تصحیح ومراجعت سے شائع ہوا تھا۔شبلی صدی کے موقع پر اس کا ایک اور محقق ایڈیشن دارالمصنفین نے شائع کیا ہے۔

سو برس میں ''الانتقاد'' کی کل تین محدود اشاعتیں جب کہ اصل کتاب کے نہ جانے کتنے ایڈیشن شائع ہوئے اور آج بھی شائع ہو رہے ہیں۔ پانچ براعظم میں پھیلنے اور پانچ زبانوں میں ترجمہ ہونے کی صراحت خود جرجی زیدان کی ہے۔ اردو میں بھی اس کے کئی ترجمے شائع ہوئے ہیں۔ حصہ اول و دوم کا ترجمہ مولوی محمد حلیم انصاری نے کیا ہے۔ جبکہ حصہ سوم کو مولانا اسلم جیراج پوری نے اردو کا جامہ پہنایا ہے۔ یہی نہیں جرجی زیدان کے ان ناولوں کے بھی جن میں مسلمانوں کی عظمت رفتہ بالقصد داغدار کی گئی ہے، اردو زبان میں متعدد ترجمے ہوئے ہیں اور راقم کی نظر سے گذرے ہیں۔

علامہ شبلی کے نام معاصرین کے خطوط کے اس جائزے سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ کس قدر علم و ادب اور قوم و ملت کے اہم مسائل و مباحث پر مشتمل ہیں اور یہ کہ ان کی افادیت ایک صدی بعد بھی کم نہیں ہوئی ہے۔ یقین ہے آئندہ بھی ان کی روشنی مدھم نہیں ہوگی۔

حوالے

(۱) باقیات شبلی ص ۸۴

(۲) ایضاً ص ۸۴

(۳) ایضاً ص ۸۴

(۴) ایضاً ص ۸۴

(۵) ایضاً ص ۱۰۹

(۶) ایضاً ص ۱۰۲

(۷) ایضاً ص ۱۰۳

(۸) ایضاً

(۹) ایضاً

(۱۰) ایضاً ص ۱۰۳

(۱۱) ایضاً ص ۱۰۴

(۱۲) رپورٹ کارروائی انجمن وقف علی الاولاد ص ۳

(۱۳) ایضاً ص ۳

(۱۴) تلاش بسیار کے باوجود مولوی محمد یوسف وکیل ہائی کورٹ کلکتہ کے حالات اور ان کا رسالہ وقف دستیاب نہ ہو سکے۔

(۱۵) ایضاً ص ۱۵

(۱۶) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو محمد انیس الرحمٰن کی کتاب ''نواب موئید الملک سر علی امام'' مطبوعہ علامہ سید سلیمان اکیڈمی کراچی، ۱۹۸۳ء

(۱۷) نواب موئد الملک سر علی امام ص ۲۶

(۱۸) رپورٹ کارروائی انجمن وقف علی الاولاد ص ۱۶

(۱۹) ایضا ص ۱۵

(۲۰) کلیات مکاتیب اقبال ج ۱ ص ۲۳۹

(۲۱) رپورٹ کارروائی انجمن وقف علی الاولاد ص ۳

(۲۲) ایضا ص ۳

(۲۳) ایضا ص ۴

(۲۴) ایضا ص ۵۔۶

(۲۵) ایضا ص ۶

(۲۶) ایضاً ص ۸

(۲۷) ایضا ص ۹

(۲۸) ایضا

(۲۹) ایضا ص ۹-۱۰

(۳۰) ایضا ضمیمہ نمبر ۱، ص ۱۳

(۳۱) ایضا۔ ضمیمہ نمبر ۱، ص ۱۳

(۳۲) ایضاً ضمیمہ ص ۱۳

(۳۳) ایضاً ص ۱۸

(۳۴) ایضاص ۱۶

(۳۵) ایضاص ۱۶

(۳۶) ایضاص ۱۷

(۳۷) ایضاص ۱۷

(۳۸) ایضاص ۱۸

(۳۹) ایضاص ۱۸۔۱۹

(۴۰) ایضاص ۱۸

(۴۱) مقالات شبلی ج ۸ ص ۲۸

(۴۲) ضمیمہ کارروائی وقف علی الاولاد ص ۱۹

(۴۳) ایضاص ۱۹-۲۰

(۴۴) ایضاص ۲۰

(۴۵) شبلی سخنوروں کی نظر میں ص ۱۴۹

(۴۶) ایضاص ۲۰

(۴۷) ضمیمہ اول کارروائی ہائے انجمن ہائے اسلامیہ متعلق مسئلہ وقف اولاد ص ۲۳۔۲۴

(۴۸) ایضاص ۲۴۔۲۵

(۴۹) ایضاص ۲۵۔۲۶

(۵۰) ایضاص ۲۶

(۵۱) مقالات شبلی ج ۸ ص ۲۸۔۲۹

(۵۲) ایضاً ج ۸ ص ۲۷

(۵۳) کلیات مکاتیب اقبال جلد اول ص ۲۳۹

(۵۴) حیات شبلی ص ۴۰۸۔۴۰۹

(۵۵) مکتوبات شبلی ص ۱۲۱

(۵۶) ماہنامہ الندوہ لکھنؤ، جون ۱۹۰۵ء ص ۱

(۵۷) الندوہ، فروری ۱۹۱۰ء ص ۴

(۵۸) ایضاً ص ۵

(۵۹) الندوہ لکھنؤ، جولائی ۱۹۰۹ء ص ۱

(۶۰) ایضاً

(۶۱) الندوہ لکھنؤ جنوری ۱۹۰۶ء ص ۲۔۳

(۶۲) ماہنامہ الندوہ لکھنو جنوری ۱۹۰۶ء ص ۳

(۶۳) الندوہ فروری ۱۹۱۰ء ص ۳۰۔۳۲

(۶۴) ایضاً ص ۳۲

(۶۵) الندوہ لکھنؤ جولائی ۱۹۰۸ء

(۶۶) ایضاً ص ۸

(۶۷) الندوہ لکھنو مارچ ۱۹۱۲ء ص ۱۵

(۶۸) الندوہ، مارچ ۱۹۱۲ء ص ۱۵،۱۶

(۶۹) الندوہ لکھنؤ، اکتوبر ۱۹۰۸ء ص ۲۱۔۲۴

(۷۰) ایضاً ص ۲۴

(۷۱) الندوہ لکھنؤ۔ فروری ۱۹۱۲ء ص ۱

(۷۲) علامہ شبلی کے نام اہل علم کے خطوط ص ۶۵۔۶۶

[اردو ادب دہلی، جنوری تا مارچ ۲۰۲۰ء]

[۳]

علامہ شبلی، اقبال اور دارالمصنّفین

دارالمصنّفین اعظم گڑھ علامہ شبلی [۱۸۵۷-۱۹۱۴ء] کی زندگی کا آخری عظیم الشان کارنامہ ہے۔اسے انہوں نے زمرہ مصنّفین کی دائمی خدمت کے تصور کے ساتھ قائم کیا تھا۔اس کی منصوبہ بندی اور عملی جدو جہد کا ابھی آغاز ہی ہوا تھا کہ علامہ شبلی نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ **انالله و اناالیه راجعون.**

ان کی وفات کے تین دن بعدان کے ماموں زاد بھائی، صاحب ''نظام القرآن'' علامہ حمیدالدین فراہی [۱۸۶۴-۱۹۳۰ء] کی سربراہی میں تلامذہ شبلی نے ایک کمیٹی اخوان الصفاتشکیل دی۔جس کے صدر علامہ حمیدالدین فراہی [۱۸۶۴-۱۹۳۰ء]، ناظم علامہ سید سلیمان ندوی [۱۸۸۴-۱۹۵۳ء]، مولانا عبدالسلام ندوی شمیم [۱۸۸۳- ۱۹۵۶ء]، مولانا مسعودعلی ندوی [۱۸۸۹- ۱۹۶۷ء] اور مولانا شبلی متکلم ندوی [م:۱۹۷۳ء] رکن قرار پائے۔ چنانچہ علامہ شبلی کے فکر وتصور کے مطابق دارالمصنّفین کے کاموں کا آغاز ہوا۔علمی دنیا کے لیے یہ ایک نیا قدم تو تھا ہی ایسا بابرکت قدم بھی ثابت ہوا کہ آج ایک صدی بعداس کی عظیم الشان خدمات ہندوستانی مسلمانوں کا لائق فخر کارنامہ شمار ہوتی ہیں۔اور بلاشبہ دارالمصنّفین نے مسلمانان برصغیر کی ذہنی تربیت میں اہم کردارادا کیا ہے۔

دارالمصنّفین کے آغاز وارتقاء میں علامہ شبلی نعمانی کے تلامذہ، اعزہ، احباب اور متعلقین سب نے اپنا اپنا حق ادا کیا۔تلامذہ شبلی نے نظم وانتظام اور علمی وعملی کارناموں سے اس کے در و بام سجائے تو احباب واعزہ اور متعلقین نے دامے، درمے، قدمے، سخنے ہر طرح کے سرگرم تعاون سے اسے ترقی دی اور اپنی انتہائی قیمتی زمینیں اس پر وقف کیں۔ پھر چراغ سے چراغ جلتا رہا۔جس

کی روشنی نے ایک عالم کومنور کیا۔الحمدللہ یہ چراغ آج بھی روشن ہےاور بقول سابق صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین[۱۸۹۷-۱۹۶۹]''دارالمصنّفین ایک سراج منیر ہے۔''(۱)

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کی انتظامیہ میں جو اہل علم و ادب اور مشاہیر اس کے رکن قرار پائے ان میں ایک نام علامہ اقبال [۱۸۷۷-۱۹۳۸ء] کا بھی ہے۔ وہ اس کی پہلی انتظامیہ کے رکن نامزد ہوئے تھےاور جس پر وہ مدۃ العمر فائز رہےاور کبھی شرکت نہ کرنے کے باوجود ان کا نام ہمیشہ شامل رہا۔

علامہ اقبال غالباً ۱۹۰۲-۱۹۰۳ء کے درمیان علامہ شبلی کے رابطے میں آئے تھے۔ چنانچہ ان کے قلم سے علامہ شبلی کا پہلا ذکر ان کی کتاب ''علم الاقتصاد'' میں ملتا ہے۔جس میں انہوں نے صراحت کی ہے کہ ''علم الاقتصاد'' کے ایک حصہ کی زبان و بیان کی اصلاح علامہ شبلی نے کی ہے۔(۲)اسی زمانہ میں علامہ شبلی نے الکلام،علم الکلام،الغزالی اورسوانح مولانا روم جیسی بلند پایہ کتابیں سپرد قلم کیں۔ علامہ اقبال کے ڈاکٹریٹ کے مقالہ (The Development of PersiaMetaphysics in) میں علم الکلام اور الغزالی کے حوالے موجود ہیں۔گویا اسی دور میں انہوں نے علامہ شبلی کی فکر ونظر اور تحقیقات کا مطالعہ کرلیا تھا۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ علامہ شبلی کی مذکورہ تصنیفات کا کسی انگریزی مقالہ میں پہلی بار حوالہ علامہ اقبال ہی کے قلم سے آیا۔(۳)

۴/جنوری ۱۹۰۳ءکوایجوکیشنل کانفرنس نے انجمن ترقی اردو کی داغ بیل ڈالی اور علامہ شبلی کواس کا پہلا سکریٹری نامزد کیا۔(۴)چنانچہ علامہ شبلی نے بڑی سرگرمی کے ساتھ انجمن ترقی اردو کو ترقی دینے کی کوشش کی اوراس کے لیے متعدد منصوبے بنائے اوران کو عملی جامہ پہنانے کے لیے بڑی جدوجہد کی۔اردو کے ممتاز اہل علم اور ادبا وشعرا کو مختلف نوعیّتوں سے انجمن سے وابستہ کیا۔ ان کے عہد میں جو ارباب کمال انجمن سے وابستہ ہوئے ان میں ایک نام علامہ اقبال کا بھی شامل ہے۔(۵)انجمن نے مختلف زبانوں کی جن چودہ اہم کتابوں کے تراجم کا منصوبہ بنایا تھا۔ان کے معیاری یا غیر معیاری ہونے کا فیصلہ کرنے والوں میں علامہ اقبال بھی شامل تھے۔(۶)چنانچہ کئی کتابیں ان کی اتفاق رائے سے شائع ہوئیں۔ان میں قابل ذکر کتاب اسپنسر کی ''ایجوکیشن'' کا ترجمہ ہے۔ جسے خواجہ غلام الحسنین [۱۸۶۸-۱۹۳۸ء] نے اردو کا جامہ پہنایا تھا۔(۷)

۱۹۰۸ء میں ارتداد کا فتنہ برپا ہوا۔ علامہ شبلی نے اس کے تدارک کے لیے جد و جہد کا آغاز کیا۔ بعض مقامات مثلاً شاہ جہاں پور اور رائے بریلی وغیرہ کا دورہ کیا۔ اس فتنہ کے سد باب کے لیے انہوں نے ایک تنظیم اشاعت اسلام تشکیل دی اور اس کا ایک مختصر خاکہ بزرگان قوم کی خدمت میں بھیجا۔ یہ منصوبہ انہوں نے علامہ اقبال کے پاس بھی بھیجا تھا۔ چنانچہ علامہ اقبال نے اس سے نہ صرف اتفاق کیا بلکہ شرکت پر بھی آمادگی ظاہر کی۔ (۸)

۲۷ تا ۲۹ دسمبر ۱۹۰۸ء کو محمڈن اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس امرتسر میں منعقد ہوا۔ اس میں شبلی و اقبال دونوں شریک ہوئے۔ (۹) یقیناً دونوں میں ملاقات بھی ہوئی ہوگی۔ اب تک دونوں کے درمیان ملاقات کا سنہ ۱۹۱۱ء قرار دیا جاتا رہا ہے۔ اس نئی اطلاع سے اب ملاقات کا سنہ ۱۹۰۸ء قرار پائے گا۔ اب یہ اطلاع بھی درست نہیں۔ دونوں بزرگوں کی پہلی ملاقات ۱۹۰۳ء میں انجمن حمایت اسلام لاہور کے جلسہ میں ہوئی تھی۔ جس میں دونوں شریک تھے۔

۱۹۱۱ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس دہلی میں منعقد ہوا تھا۔ اس میں بھی شبلی و اقبال دونوں نے شرکت کی۔ کانفرنس نے اس موقع پر علامہ اقبال کو ''ترجمان حقیقت'' کا خطاب دیا۔ یہ خطاب علامہ شبلی کے ہاتھوں دیا گیا۔ یہی نہیں علامہ شبلی نے اقبال کو پھولوں کا ہار بھی پہنایا اور اپنے خطاب میں کہا کہ

> ''یہ رسم کوئی معمولی رسم نہیں ہے اور اس کو محض تفریح تصور نہ کرنا چاہیے۔ ہم مسلمانوں کا شعار رہا ہے کہ ہم جس قدر قوم کی دی ہوئی عزت اور خطابات کی قدر کرتے ہیں، اتنی کسی اور عزت کی شہرت ہمارے ناموں کی نہیں ہوئی۔ ....جو عزت قوم کی طرف سے آج ڈاکٹر اقبال کو دی جاتی ہے، وہ ان کے لیے بڑی عزت و توقیر کی بات ہے اور حقیقت میں وہ اس عزت کے مستحق ہیں۔ ڈاکٹر اقبال کا علم، ادب اور ان کی شاعری کا مقابلہ غالب کی شاعری سے کیا جائے تو مبالغہ نہیں ہوسکتا۔'' (۱۰)

اس اجلاس کی صدارت مولانا شاہ سلیمان پھلواروی (م: یکم جون ۱۹۳۵ء) نے کی تھی۔ انہوں نے اپنے تاثرات کا اظہار ان الفاظ میں کیا۔

> ''اقبال صاحب کے لیے یہ موقع بہت ہی مبارک ہے اور ہمیں بھی بڑی مسرت ہے

کہ اس جلسہ میں انہوں نے علامہ شبلی کے مقتدر ہاتھوں سے پھولوں کے ہار پہنے، نام بھی مبارک، کام بھی مبارک، پھولوں کا ہار بھی مبارک اور ہار ڈالنے والے کا دست کرم بھی مبارک''۔(۱۱)

یہ زمانہ ہندوستان میں اس لحاظ سے بڑا نازک تھا کہ مشنری اور اسلام مخالف عناصر کے اسلام پر حملے تیز تر ہو گئے تھے۔اس کے سد باب کے لیے علامہ شبلی نے ۱۹۱۲ء میں ایک ''مجلس علم کلام'' بنائی تھی، جس میں قدیم علماء کے ساتھ جدید تعلیم یافتہ اشخاص کو بھی رکن نامزد کیا گیا تھا۔ علامہ شبلی کا خیال تھا کہ دونوں کے اجتماع کے بغیر نئے حالات کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔اس مجلس میں بھی انہوں نے علامہ اقبال کو شامل کیا تھا۔(۱۲)

اسی زمانہ میں اوقاف اسلامی کی بربادی اور انگریز ججوں کے غیر منصفانہ فیصلوں سے پریشان ہو کر علامہ شبلی نے تحریک وقف علی الاولاد شروع کی تو اس میں بھی علامہ اقبال کی شمولیت ضروری خیال کی۔اس سلسلہ میں انگریزی حکومت پر وقف علی الاولاد کے صحیح معنی و مفہوم واضح کرنے کے لیے جو وفد ترتیب دیا تھا اس میں بھی علامہ اقبال کو شامل کیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے علامہ اقبال کو خط لکھا اور کلکتہ چلنے کی خواہش کی۔اس کے جواب میں علامہ اقبال نے جو خط لکھا تھا وہ ''کلیات مکاتیب اقبال'' میں شامل ہے۔اگرچہ انہوں نے معذرت کی تاہم اس خط سے ان کی تائید وحمایت بھی واضح ہوتی ہے۔(۱۳)

علامہ اقبال کے بعض خطوط سے واضح ہوتا ہے کہ انہوں نے بھی علامہ شبلی سے ادب و احترام کا معاملہ روا رکھا۔وہ ان کے علم و فضل سے اس قدر متاثر تھے کہ انہیں مستقل طور پر پنجاب میں اقامت گزیں کرنا چاہتے تھے اور اس کے لیے انہوں نے بڑی کوشش کی مگر ان کی یہ کوشش بار آور نہ ہو سکی۔(۱۴)

۱۸رنومبر۱۹۱۴ء کو علامہ شبلی نے وفات پائی تو علامہ اقبال نے ایک نظم ''حالی و شبلی'' لکھ کر انہیں خراج عقیدت پیش کیا جو ان کے مجموعہ کلام بانگ درا میں شامل ہے۔انہوں نے اس مصرعہ

امام الہند والا نژاد شبلی طاب ثراہ

سے تاریخ وفات (۱۳۳۲ھ) کہی، جو ان کے متروک کلام میں شامل ہے۔(۱۵)

یہ مصرعہ علامہ اقبال کے متروک کلام کا حصہ کیوں؟ ہے۔اس کا سبب معلوم نہ ہوسکا۔

علامہ اقبال ''سیرۃ النبیؐ'' اور ''شعرالعجم'' کے بھی بڑے مداح تھے۔سیرۃ النبی کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ ''مولانا مرحوم نے مسلمانوں پر بہت بڑا احسان کیا ہے جس کا صلہ دربار نبویؐ سے عطا ہوگا۔''(۱۶)

علامہ شبلی اور علامہ اقبال کی شخصیت اور فکر ونظر میں بڑی ہم آہنگی اور یکسانیت پائی جاتی ہے۔ دونوں کے سوانح اور افکار اور نظریات کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ دونوں کا مقصد حیات اور غور وفکر کا انداز بھی تقریباً یکساں ہے۔غالباً یہی وجہ ہے کہ سید افتخار حسین شاہ نے ایک مفصل تجزیے کے بعد علامہ اقبال کو پیروِ شبلی قرار دیا ہے۔(۱۷) عالم خوندمیری نے اپنے تجزیے میں لکھا ہے کہ ''ملت میں سربلند ہونے کی جو تمنا ہمارے دلوں میں مچل رہی ہے۔اس تمنا کی چنگاری علامہ شبلی نے سلگائی تھی۔(۱۸) انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ ''شبلی کے اصل وارث ابوالکلام آزاد اور علامہ اقبال ہیں۔''(۱۹)

شبلی و اقبال کی فکری ونظری ہم آہنگی کی متعدد مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔خاص طور پر علم کلام سے دونوں کی دلچسپی اور اس کی تعبیر وتشریح ،الکلام اور جاوید نامہ کے صفحات میں ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔اسی طرح رومی کے افکار ونظریات سے دونوں متاثر تھے اور مولانا روم کے مطالعہ کا محور بھی ایک جیسا تھا۔

علامہ شبلی نے جس علمی انداز میں مسلمانوں کی صلاح وفلاح کے لیے جد وجہد کا آغاز کیا تھا،ان کی وفات کے بعد ان کے تلامذہ ،منتسبین اور متاثرین نے اس سلسلہ کو آگے بڑھایا۔یہی وجہ ہے کہ دارالمصنّفین کے کاموں کا سلسلہ جب دراز ہوا تو فکری وابستگی ہی کی بنا پر ان کے تلامذہ کے ساتھ ان کے احباب اور متاثرین ایک ایک کرکے اس سے وابستہ ہوتے چلے گئے۔ان میں ایک اہم نام علامہ اقبال کا بھی ہے۔جنہوں نے مدۃ العمر دارالمصنّفین اور معمار دارالمصنّفین مولانا سید سلیمان ندوی[۱۸۸۳-۱۹۵۳ء] سے ربط وتعلق قائم رکھا اور دارالمصنّفین کی علمی کاوشوں سے نہ صرف دلچسپی لیتے رہے، بلکہ اس میں برکت کی دعا بھی کی۔

علامہ شبلی کے جانشین ،بلند پایہ عالم دین اور دارالمصنّفین کے ناظم کی حیثیت سے مولانا

سید سلیمان ندوی سے علامہ اقبال کے روابط قائم ہوئے۔ وہ علامہ شبلی کے بعد سید صاحب کو استاذ الکل خیال کرتے تھے۔(۲۰) اور انہیں علوم اسلامیہ کی جوئے شیر کا فرہاد قرار دیتے تھے۔(۲۱) یہی سبب ہے کہ دونوں میں علمی وفکری تعلق کے ساتھ ذاتی اور نج کے تعلقات قائم ہو گئے تھے۔ چنانچہ علامہ اقبال سے سید سلیمان ندوی کی مدۃ العمر خط وکتابت رہی جس میں علمی، فکری، مذہبی بالخصوص تصوف اور کلام وعقائد کے موضوعات پر افہام وتفہیم خاص طور پر اسلامی فکر وفلسفہ کے متنوع موضوعات زیر بحث آئے ہیں۔ علامہ اقبال نے سید صاحب کو جو خطوط لکھے تھے اسے دارالمصنّفین نے ''مشاہیر کے خطوط بنام سید سلیمان ندوی'' میں شائع کر دیا ہے۔ ان خطوط سے بھی واضح ہوتا ہے کہ دبستان شبلی اور اقبال کے افکار ونظریات میں خاص طور پر ملت کو بربادی سے بچانے اور زبوں حالی سے نکالنے کے طریقہ کار اور غور وفکر میں بڑی حد تک مماثلت اور یکسانیت پائی جاتی ہے۔

دارالمصنّفین کے علمی کارناموں پر اقبال کی ہمیشہ نظر رہی۔ انہوں نے متعدد علمی وتصنیفی مشورے دئے۔ جن پر سید صاحب نے عمل کیا۔ تاریخ فقہ اسلامی اور حکمائے اسلام جیسی بلند پایہ کتابیں اقبال ہی کے مشورہ سے وجود میں آئیں اور شائع ہوئیں۔(۲۲) تحریک خلافت کے زمانہ میں مولانا سید سلیمان ندوی نے اس موضوع پر ماہنامہ معارف میں ایک سلسلہ مضامین شروع کیا تھا، بعض دوسرے رفقاء نے بھی اس موضوع پر مقالات سپرد قلم کیے تھے۔ چنانچہ علامہ اقبال نے انہیں کتابی صورت میں شائع کرنے کا مشورہ دیا۔ اس مشورہ پر اگرچہ ان کی زندگی میں عمل نہیں ہو سکا تاہم بعد میں دوسرے اداروں نے ان مضامین کے مجموعے شائع کیے۔ اسی طرح معارف میں روسی مسلمانوں پر مقالہ شائع ہوا تو اقبال نے اسے بھی کتابی صورت میں شائع کرنے کا مشورہ دیا۔(۲۳) مگر دارالمصنّفین اسے بھی شائع نہ کر سکا۔

علامہ اقبال دارالمصنّفین کے لیے فکر مند رہتے تھے اور اس کے کاموں میں برکت کی دعا کرتے تھے۔ ان کی نظر میں دارالمصنّفین اور اس کے علمی کارناموں کا مرتبہ بہت بلند تھا۔ مولانا سید سلیمان ندوی کا بیان ہے کہ سفر افغانستان کے دوران، میں نے علامہ اقبال سے کہا کہ جب تک آپ کی شاعری زندہ رہے گی، ہندوستان میں اسلام باقی رہے گا۔ علامہ اقبال نے فرمایا نہیں

جب تک دارالمصنّفین کی تصنیفات باقی رہیں گی ہندوستان میں اسلام باقی رہے گا۔ سرراس مسعود [۱۸۸۹-۱۹۳۷ء] بھی وہاں موجود تھے، انہوں نے کہا کہ اسے یوں کہہ لیجئے کہ جب تک اقبال کی شاعری اور دارالمصنّفین کی تصنیفات باقی ہیں ہندوستان میں اسلام باقی رہے گا۔ (۲۴)

اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ علامہ اقبال کی نظر میں شبلی، سید سلیمان ندوی اور دارالمصنّفین کا کیا مقام و مرتبہ تھا اور وہ ان کو کس اہمیت کی نظر سے دیکھتے تھے۔

علامہ اقبال کی وفات کے بعد دارالمصنّفین نے ان کی سوانح عمری شائع کرنے کا فیصلہ کیا تو دبستان شبلی کے اردو شعر و ادب کے سب سے بڑے اداشناس مولانا عبدالسلام ندوی کو یہ ذمہ داری سونپی گئی اور انہوں نے اقبال کامل کے نام سے ایسی عمدہ اور معرکتہ الآرا کتاب لکھی کہ اسے اقبالیات کی ابتدائی دو تین اہم کتابوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ (۲۵) اولیت اور افضلیت کے اعتبار سے دیکھا جائے تو مولانا عبدالسلام ندوی آزاد ہندوستان کے پہلے اقبال شناس ہیں اور اقبال کامل اقبال شناسی کا اولین نمونہ۔

مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالسلام ندوی کے بعد دارالمصنّفین کی زمام کار جن اہل قلم کے ہاتھوں میں رہی انہوں نے بھی علامہ اقبال کے دارالمصنّفین، بانی دارالمصنّفین اور معمار دارالمصنّفین سے دیرینہ تعلق کی بنا پر اقبالیاتی ادب پر بڑی توجہ دی۔ تقسیم ہند کے بعد علامہ اقبال پر فرقہ پرستی کا الزام عائد ہوا تو دارالمصنّفین کے اس وقت کے ناظم مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی [۱۹۰۳-۱۹۷۴ء] نے اس کا بڑا مدلل اور مسکت جواب معارف کے صفحات میں دیا۔ (۲۶) جس سے اس طرح کے الزامات کا تقریباً خاتمہ ہو گیا۔ بعد ازاں ایک طویل مقالہ میں اقبال کی تعلیمات کی توضیح و تشریح کی۔ (۲۷) یہ توضیحات اس قدر دلنشیں انداز میں کی گئی ہیں کہ دانائے راز کا ایک ایک رمز واضح ہو کر سامنے آجاتا ہے۔ اس سے شاہ صاحب کی اقبالیات پر گہری نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔

شاہ صاحب کے بعد سید صباح الدین عبدالرحمٰن [۱۹۱۱-۱۹۸۷ء] دارالمصنّفین کے ناظم مقرر ہوئے۔ وہ دور طالب علمی میں علامہ اقبال سے شرف ملاقات حاصل کر چکے تھے۔ انہوں نے اقبالیات پر نہ صرف مقالات کی اشاعت کا اہتمام کیا بلکہ بین الاقوامی اقبال کانگریس میں

شرکت کے لیے پاکستان تشریف لے گئے۔فرزند اقبال جاوید اقبال کی کتاب ''زندہ رود'' پر سید صباح الدین عبدالرحمٰن نے جو تفصیلی تبصرہ لکھا ہے وہ ان کی عقیدت اقبال کا مظہر ہے۔ان کے بعد کے نظمائے دارالمصنّفین اور مدیران معارف مولانا ضیاء الدین اصلاحی مرحوم [۱۹۳۷-۲۰۰۸ء] اور پروفیسر اشتیاق احمد ظلی صاحب نے بھی اقبال پر مضامین و مقالات ماہ نامہ معارف میں شائع کر کے اقبالیاتی ادب کی اشاعت میں حصہ لیا اور ہنوز یہ سلسلہ قائم ہے۔یقین ہے کہ اقبال شناسی کا یہ سلسلہ آئندہ بھی قائم رہے گا۔

دبستان شبلی کے دو ممتاز شعراء اقبال احمد خاں سہیل [۱۸۸۴-۱۹۵۵ء] اور یحییٰ اعظمی [۱۹۰۶-۱۹۷۲ء] کی توجہ کا مرکز بھی علامہ اقبال کی ذات رہی۔خاص طور پر یحییٰ اعظمی نے متعدد نظموں کے ذریعہ اقبال کو زبردست خراج عقیدت پیش کیا۔یہی نہیں انہوں نے اپنی نظموں میں افکار اقبال کی نشاندہی بھی کی ہے۔ان کی نظموں کے عناوین یہ ہیں:

۱۔ ماتم اقبال

۲۔ آہ! اقبال

۳۔ غم اقبال

۴۔ خطاب بہ شاعر حکیم ہند

۵۔ شاعر مشرق اور فلسفہ حیات ملی

یہ نظمیں ان کے پہلے مجموعہ کلام ''نوائے حیات'' (مطبوعہ: دہلی: ۱۹۴۶ء) میں موجود ہیں۔انہیں علامہ اقبالؒ سے اس قدر لگاؤ تھا کہ جب انہیں علامہ اقبال کی وفات حسرت آیات کی اطلاع ملی تو وہ بے ساختہ رو پڑے۔(۲۸)

دارالمصنّفین کے ماہوار علمی رسالہ معارف سے علامہ اقبال نے بڑی دلچسپی تھی۔اس کے مطالعہ کا وہ اہتمام کرتے تھے۔بلکہ اس کا انہیں انتظار رہا کرتا تھا۔اشاعت کے لیے اس میں انہوں نے اپنی بعض تخلیقات بھیجیں۔چنانچہ ان کی کئی تخلیقات اولاً ماہنامہ معارف ہی کے صفحات میں جلوہ گر ہوئیں۔ان کی مشہور تخلیق جس کا پہلا شعر یہ ہے:

نہ سلیقہ مجھ میں کلیم کا نہ قرینہ تجھ میں خلیل کا

میں ہلاک جادوئے سامری تو قتیل شیوۂ آذری

اولاً معارف ہی کے اوراق کی زینت بنی۔(۲۹) اسی طرح ان کا یہ لازوال کلام بھی اولاً معارف میں شائع ہوا۔

بہت آزمایا ہے غیروں کو تو نے　　مگر آج ہے وقت خویش آزمائی
نہیں تجھ کو تاریخ سے آگہی کیا　　خلافت کی کرنے لگا تو گدائی
خریدیں نہ ہم جس کو اپنے لہو سے　　مسلماں کو ہے ننگ وہ پادشاہی

انہوں نے اپنے کلام کے ساتھ تبصرہ کے لیے مثنویات اور بعض مجموعہ کلام بھی بھیجے جس پر سید صاحب نے تبصرے لکھے۔ ان تبصروں کو بھی وہ بڑی اہمیت دیتے تھے۔ سید صاحب نے معارف میں ان کے کلام پر تنقیدیں لکھیں تو اقبال نے انہیں بھی بنظر استحسان دیکھا اور سید صاحب کو لکھا کہ اقبال آپ کی تنقید سے مستفید ہوگا۔(۳۰)

ماہنامہ معارف کے وہ بڑے قدرداں تھے۔ ان کی نظر میں معارف کی جو اہمیت تھی اس کا اندازہ ان کے اس خیال سے لگایا جاسکتا ہے کہ ''معارف ایک ایسا رسالہ ہے جس کے پڑھنے سے حرارت ایمانی میں ترقی ہوتی ہے۔(۳۱)

ماہنامہ معارف کے صفحات میں اقبالیاتی ادب کا بہت بڑا ذخیرہ محفوظ ہے۔ ان کی شخصیت اور فکر وفن پر پچاسوں اہم مضامین معارف میں شائع ہوئے ہیں اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ اگر اقبالیات معارف کو کتابی صورت میں شائع کیا جائے تو وہ کئی جلدوں پر مشتمل ہوگا اور اس کی انفرادیت یہ ہوگی کہ شاید ہی ان کے فکر وفن کا کوئی اہم گوشہ تشنہ ہوگا۔ اسی طرح اقبال پر ہندو پاک میں لکھی جانے والی سیکڑوں کتابوں کا تعارف وتجزیہ شائع کرنے کا سہرا بھی ماہنامہ معارف ہی کے سر ہے، بلکہ اس خاص معاملہ میں شاید ہی کوئی اور رسالہ معارف کی ہم سری کا دعویٰ کر سکے۔

۱۹۳۸ء میں علامہ اقبال نے وفات پائی تو ہر طرف صف ماتم بچھ گئی۔ اہل قلم نے مضامین اور شعرا نے مراثی لکھے۔ ماہنامہ معارف میں بھی اس طرح کی کاوشیں شائع ہوئی ہیں۔ خود مولانا سید سلیمان ندوی نے ایسا پرزور وفیاتی مضمون لکھا ہے کہ اس کو اہل دل پڑھ کر آج بھی آزردہ ہوجاتے ہیں۔ غرض جو اہم شخصیات دارالمصنّفین کی تاریخ کا حصہ بنیں، ان میں علامہ اقبال کا نام

بھی شامل ہے۔ یہ یقیناً دارالمصنّفین کی تاریخ کا ایک اہم اور ناقابل فراموش باب ہے۔

حوالے

(۱) افکار ذاکر ص ۵۷، مرتبہ پروفیسر اختر الواسع، مکتبہ جامعہ دہلی، ۲۰۰۵ء

(۲) دیباچہ علم الاقتصاد ص ج، طبع دوم

(۳) بحوالہ اقبال اور مشاہیر ص ۱۲۷۔ از طاہر تونسوی

(۴) انجمن ترقی اردو کی کہانی، ص ۶

(۵) باقیات شبلی، ص ۱۰۵

(۶) ایضاً ص ۸۷

(۷) فلسفہ تعلیم، ص ۳-۴

(۸) مقالات شبلی، ج ۶ ص ۲۷

(۹) فہرست ممبران و وزیٹران متعلق آل انڈیا محمڈن اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس ص ۳۶ و ۴۴

(۹) اقبال اور پیروی شبلی، ص ۴۲

(۱۰) زندہ رود، حیات اقبال کا وسطی دور، ص ۱۵۵

(۱۱) مقالات شبلی، ج ۸، ص ۶۲ - ۶۳، طبع جدید، ۲۰۱۰ء

(۱۲) کلیات مکاتیب اقبال حصہ اول، ص ۲۳۹

(۱۳) اقبال اور دبستان شبلی، ص ۴۵

(۱۴) کلیات باقیات شعر اقبال، ص ۵۱۵، ڈاکٹر صابر کلوروی، اقبال اکادمی، پاکستان، ۲۰۰۴ء

(۱۵) مشاہیر کے خطوط، ص ۹۹

(۱۶) اقبال اور پیروی شبلی، ص ۴۲

(۱۷) ماہ نامہ صبا حیدرآباد، شبلی نمبر، ص ۵۶

(۱۸) ایضاً

(۱۹) اقبال اور دبستان شبلی، ص ۴۷

(۲۰) مشاہیر کے خطوط، ص ۹۸

(۲۱) ایضاً، ص ۱۳۴

(۲۲) اقبال اور دبستان شبلی، ص ۵۹

(۲۳) بزم رفتگاں حصہ اول، ص ۱۸۴، سید صباح الدین عبدالرحمٰن، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۲۰۰۷ء

(۲۴) فکر اقبال، ص ۱۴، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۱۹۷۷ء

(۲۵) ماہ نامہ معارف جنوری، فروری ۱۹۵۰ء

(۲۶) ماہ نامہ معارف اکتوبر ۱۹۷۱ء تا جنوری ۱۹۷۲ء

(۲۷) گاہے گاہے باز خواں، ص ۶۵، ڈاکٹر شعیب اعظمی، الکتاب انٹرنیشنل دہلی، ۲۰۰۷ء

(۲۸) ماہ نامہ معارف جون ۱۹۱۸ء

(۲۹) مشاہیر کے خطوط، ص ۹۸

(۳۰) اقبال اور دبستان شبلی، ص ۴۸

○○○

[۴]

علامہ شبلی کے چند نو دریافت غیر مدون خطوط اور ان کے مکتوب الیہ

ماہنامہ معارف اگست ۲۰۱۹ء میں علامہ شبلیؒ [۱۸۵۷-۱۹۱۴ء] کے ۳۶ر نو دریافت غیر مطبوعہ خطوط راقم نے تعلیقات وحواشی کے ساتھ قارئین معارف کی نذر کئے تھے۔ جو اس لحاظ سے بے حد اہم تھے کہ وہ علامہ شبلی کے اکلوتے فرزند حامد حسن نعمانی [۱۸۸۰-۱۹۴۲ء] کے نام ہیں اور ان میں بیشتر خطوط خانگی احوال ومعاملات پر مبنی ہیں۔ ان کی اشاعت کے بعد اب تک تیرہ نئے اور غیر مدون خطوطِ شبلی مختلف کتب ورسائل سے ہاتھ آ گئے ہیں۔ اس کی تفصیل اس طرح ہے:

۱۔ قاضی سراج الدین احمد کے نام ۲ر خط
۲۔ نواب غلام احمد کلامی کے نام ۱ر خط
۳۔ مولانا رحمٰن علی کے نام ۱ر خط
۴۔ مولانا مفتی شیر علی کے نام ۹ر خط

قاضی سراج الدین احمد [۱۸۶۶-۱۹۲۵ء] ابن قاضی کریم الدین بار ایٹ لا، ایڈیٹر ہفتہ روزہ سرمور گزٹ ناہن، سرسید احمد خاں [۱۸۱۷-۱۸۹۸ء] کے دوست اور علی گڑھ تحریک کے خاص لوگوں میں تھے۔ وہ راولپنڈی میں مختلف عہدوں پر فائز رہے اور متعدد اہم علمی و صحافتی کام انجام دئے۔ راولپنڈی مسلم لیگ کے صدر رہے۔ انجمن اسلامیہ راولپنڈی کے سکریٹری اور راجہ ریاست پونچھ اور چیف جج پونچھ کے پی اے بھی رہے۔ ۱۹۰۷ء میں کچھ دنوں تک وکالت بھی کی۔ اسلامیہ ہائی اسکول راولپنڈی کے بانی بھی وہی ہیں۔ وہ ایک مصنف، صحافی اور قانون داں کی حیثیت سے اپنے عہد میں ممتاز تھے۔ حیات سلطان صلاح الدین [م:۱۸۹۷] ، جنگ ترکی و

یونان۔ تعلیم [م:۱۸۹۲ء]، تہذیب، فصاحت [م:۱۹۰۹ء]، فضیلت، حقیقت خلافت [طبع دوم ۱۹۲۰ء] سرسید احمد خاں کے لکچروں کا مجموعہ مع سوانح عمری [م:۱۸۹۰ء] داستان پاستان اور سیرۃ الفاروق [م:۱۸۹۳ء] وغیرہ ان کی تصنیفات وتالیفات اور کتب ورسائل ہیں۔ انہوں نے کئی اخبار ورسائل مثلاً ہفتہ وار سرمور گزٹ ناہن [۹۳-۱۸۹۱ء] ہفتہ وار ''چودھویں صدی'' راولپنڈی [۱۸۹۹ء] اور پندرہ روزہ محمڈن نیشنل میگزین سیال کوٹ [۱۸۹۳ء] کی مختلف وقتوں میں ادارت کے فرائض انجام دئے اور اپنی محنت وصلاحیت سے انہیں مقبول عام بنایا۔

۱۸۹۳ء میں قاضی سراج الدین احمد نے علامہ شبلی کی تصنیف ''الفاروق'' پر سبقت کی غرض سے بعجلت تمام ''سیرۃ الفاروق'' لکھ کر شائع کی۔ اس کوشش وسبقت کو علاوہ اور لوگوں کے خود سرسید احمد خاں نے بھی ناپسندیدہ فعل قرار دیا اور اس کے خلاف اپنے اخبار علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں ایک تحریر شائع کی۔ (۱)

محمڈن نیشنل میگزین سیال کوٹ میں قاضی سراج الدین نے اپنے ایک علمی اور تصنیفی منصوبے کا اعلان شائع کیا ہے۔ ان کا منصوبہ یہ تھا کہ اہل علم بالخصوص ہندوستان کے مشاہیر کا تذکرہ قلم بند کیا جائے۔ اس کے لئے انہوں نے علامہ شبلی سے مشورہ کیا۔ چنانچہ انہوں نے نہ صرف مفید مشورے دئے، بلکہ مشاہیر اہل علم وارباب کمال کی ایک فہرست بھی تیار کر کے دی (۲)، مگر اس وقت بوجوہ اس کام کا آغاز نہ ہوسکا۔

اگست ۱۸۹۳ء میں منشی سراج الدین نے دوبارہ اس کام کا تہیہ کیا اور پرعزم ہوکر اہل علم اور بزرگوں سے ملاقات کی۔ لیکن اس بات سے مایوس ہوئے کہ جن بزرگوں کے نام ان کی فہرست میں شامل تھے۔ انہوں نے جیسا چاہئے تھا تعاون نہیں کیا۔ اس سلسلہ میں انہوں نے نواب محسن الملک [۱۸۳۷-۱۹۰۷ء] کا ذکر کیا ہے۔ اور یہ بھی لکھا ہے کہ یہی معاملہ محسن قوم سرسید احمد خاں کا بھی تھا۔ (۳) دراصل بات یہ تھی کہ اس عہد میں اپنے بارے میں کچھ لکھنا لکھانا معیوب خیال کیا جاتا تھا۔ اس وقت کیا آج بھی سنجیدہ اشخاص اور اہل علم اسے ناپسند کرتے ہیں۔ اس بار پھر قاضی سراج الدین احمد نے علامہ شبلیؒ سے خط وکتابت کی۔ چنانچہ علامہ شبلی نے پھر تعاون کا وعدہ کر کے قاضی صاحب کا حوصلہ بڑھایا۔ مگر جب ان کی مرسلہ فہرست مشاہیر پر نظر

پڑی تو انہوں نے قاضی سراج الدین کو لکھا کہ

[۱]

مشاہیر کا تذکرہ معقول تجویز ہے، لیکن افسوس اور سخت افسوس ہے کہ آپ نے ہماری قدیم تعلیم وعلوم کی کچھ قدر نہ کی۔ اس سے زیادہ کیا ظلم ہوگا کہ مجھ سے ہیچ میرز کا نام فہرست میں ہو اور جناب مولوی نذیر حسین صاحب محدث دہلوی، مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی، شمس العلماء مولوی عبدالحق صاحب خیرآبادی، مولوی عنایت رسول صاحب چریا کوٹی وغیرہ بزرگوں کو پوچھا تک نہ جائے اور حقیقت یہ ہے کہ ان بزرگوں کو ہم جیسوں کے شمار میں داخل ہونا بھی عار ہے۔ چنانچہ سنا ہے کہ مولوی عبدالحق صاحب خیرآبادی نے اول شمس العلماء کا خطاب لینے سے منع کر دیا ہے۔

اجمالاً آپ کا یہ لکھنا کہ اور علماء اور شعراء کا تذکرہ لکھنا بھی منظور ہے۔ اس غلطی کا کفارہ نہیں ہوسکتا۔ ان بزرگوں کی اس لحاظ سے بھی قدر کرنی چاہئے کہ آپ کی فہرست والے لوگ نئی تعلیم کے ذریعہ سے پیدا ہوسکتے ہیں، لیکن ان بزرگوں کے خاتمہ پر ہماری تعلیم قدیم کا خاتمہ ہے۔ آپ ضرور اس فہرست کو وسیع کیجئے۔ اس بات کی بھی کوئی وجہ نہیں کہ داغ، امیر، عزیز لکھنوی (شاعر فارسی) وغیرہ نظرانداز کئے جائیں۔

والسلام

شبلی (۴)

اس خط کے بعد علامہ شبلی کو یاد آیا کہ قاضی سراج الدین احمد نے اپنی فہرست مشاہیر میں خدائے سخن شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد [۱۸۳۰-۱۹۱۰ء] کا نام بھی شامل نہیں کیا گیا ہے تو انہوں نے منشی جی کو دوسرا مکتوب روانہ کیا اور لکھا کہ

[۲]

آپ کی فہرست میں آزاد کا نام نہیں ہے۔ مشاہیر قوم اور بالخصوص مصنّفین اردو کی جو فہرست آزاد کے نام سے خالی ہو وہ ناتمام اور محض ناتمام ہے۔ اردو اگر ایک

جداگانہ دنیا ہے اور اس کے مختلف اقالیم میں الگ الگ سلطنتیں ہیں تو آزاد سلطنت تمسعہ کا مالک اور صاحب تاج وتخت ہے۔اس قسم کی فروگذاشتیں معذوری کے قابل نہیں۔ والسلام

شبلی (۵)

علامہ شبلی کی ان معروضات کو منشی سراج الدین احمد ایڈیٹر چودھویں صدی راولپنڈی نے مثبت انداز میں لیا اور اعتراف کیا کہ

''درحقیقت مولانا مولوی محمد حسین صاحب آزاد کا نام بھول جانے کی تو ہم سے غلطی ہوئی تھی لیکن اس سے زیادہ ناموں کو چھوڑ دینے اور دوسرے بزرگوں کے اسمائے گرامی داخل فہرست نہ کرنا ہماری واقفیت اور علم کا قصور تھا۔ ہم اپنے مولانا کے نہایت شکر گذار ہیں کہ انہوں نے بعض بزرگوں کے ناموں سے ہم کو اطلاع فرما کر ایسی بدنما غلطی سے بہت جلد بچالیا اور ہم ان تمام بزرگوں کے ناموں کو جو مولانا ممدوح نے اپنے گرامی نامہ میں لکھے ہیں، اپنی فہرست میں مع اپنے مخدوم مولانا مولوی سید احمد صاحب دہلوی مصنف فرہنگ آصفیہ کے نام کے اپنی فہرست میں داخل کرتے ہیں۔'' (۶)

شاید قاضی سراج الدین احمد کا یہ علمی منصوبہ منصوبہ ہی رہ گیا۔ ہمیں نہیں معلوم کہ آیا وہ یہ تذکرہ لکھنے میں کامیاب ہوئے یا نہیں۔ لیکن ان کی جن چند تصانیف اور کتب ورسائل کا ذکر ملتا ہے۔ ان میں کسی ایسے تذکرے کا نام شامل نہیں ہے۔ قاضی صاحب نے ۲۵ / جولائی ۱۹۲۵ء کو راولپنڈی میں وفات پائی۔

۲۔ دوسرے مکتوب الیہ قائدالملک نواب غلام احمد کلامی [م: دسمبر ۱۹۴۷ء] سابق صدر سینٹرل محمڈن ایسوسی ایشن بنگلور ہیں۔ وہ اصلاً ریاست راجن گڑھ ترچناپلی تامل ناڈو کے چشم و چراغ تھے۔ سقوط سری رنگاپٹن کے بعد نواب آرکاٹ کی ایما پر راجن گڑھ پر قبضہ کرلیا گیا اور ان کے جد امجد کو پنشن دیدی گئی۔ یہی پنشن وراثتاً نواب غلام احمد کلامی کے حصہ میں آئی، جو ان کے عہد میں بائیس روپیہ آٹھ آنہ تھی۔ چنانچہ نواب صاحب ذاتی اور خانگی مسائل کی بنا پر راجن گڑھ کو

خیر باد کہہ کر پہلے ترچناپلی پھر ویلور کی راہ لی۔مختلف مقامات پر مختلف ملازمت اور مصائب سے گذر کر ایک انگریز افسر کے تعاون سے تجارت کا آغاز کیا۔جس میں اللہ تعالی نے بڑی برکت عطا کی اور وہ ایک بڑے تاجر کہلائے۔

نواب غلام احمد کلامی نے اپنے علاقہ کے مسلمانوں کی علمی وتعلیمی ترقی کے لئے تقریباً چالیس برس جدو جہد کی۔انہیں سر سید احمد خاں، ایم، اے، او، کالج اور علی گڑھ تحریک سے بڑا لگاؤ تھا اور وہ سر سید احمد خاں کی کتابیں اور مضامین کا پابندی سے مطالعہ کرتے تھے اور بقول نواب صاحب انہی کے مطالعہ سے ان کے اندر اسلامیت پیدا ہوئی۔(۷)

سر سید اور نواب صاحب کے درمیان خط وکتابت کا سلسلہ بھی قائم رہا۔نواب صاحب نے علی گڑھ کالج کی طرح وانم باڑی میں بھی ایک کالج قائم کرنے کا خواب دیکھا، مگر وہاں کے باشندوں نے اس سے دلچسپی نہیں لی اور وہ پورا نہ ہوسکا۔البتہ انہوں نے ایک ہائی اسکول، ایک کتب خانہ اور ایک مسلم بورڈنگ ہاؤس وغیرہ قائم کرنے میں ضرور کامیابی حاصل کی۔(۸)

وہ مسلمانان پریسیڈنٹی مدراس اور میسور کے ہر طرح کے معاملات ومسائل سے دلچسپی لیتے۔یہی وجہ ہے کہ وہاں ان کا بڑا ادب واحترام اور قدر ومنزلت تھی۔میسور کے راجہ اور پرجا سب لوگوں کو ان سے بڑا تعلق خاطر تھا۔یہی سبب ہے کہ میسور کے راجہ نے انہیں قائد الملک کا خطاب اور خلعت عطا کی۔۱۲/اپریل ۱۹۴۲ء کو میسور میں میسور کے عوام وخواص کی طرف سے ایک تقریب میں انہیں سپاس نامہ پیش کیا گیا، جس میں دس ہزار کی ایک بڑی رقم بھی نذر کی گئی۔جسے انہوں نے اپنے ڈھائی ہزار روپئے کے ساتھ انجمن کو ہدیہ کردیا۔یہی نہیں اس موقع پر انہوں نے اپنا انتہائی قیمتی کتب خانہ بھی قوم کی نذر کردیا۔سپاس نامہ کے جواب میں انہوں نے بڑی شاندار تقریر کی، جس سے ان کی ملی حمیت وغیرت اور مسلمانوں کے مسائل سے واقفیت کا اندازہ ہوتا ہے۔سپاس نامہ اور اس کا جواب دونوں شائع ہوئے ہیں اور مطالعہ کے لائق ہیں۔

نواب صاحب علی گڑھ کالج کے اخبارات ورسائل کے خریدار بھی تھے۔اس سلسلہ میں سر سید سے ان کی خط وکتابت بھی ہوئی تھی۔پروفیسر مظفر علی شہ میری وائس چانسلر ڈاکٹر عبدالحق اردو یونیورسٹی کرنول آندھرا پردیش نے اپنی کتاب ''نقش ونظر'' میں ان کے نام سر سید کے خطوط کو جمع

کر کے ان پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔(۹) اسی سلسلہ میں نواب غلام احمد کلامی نے علامہ شبلی کو بھی ایک خط لکھا تھا۔ اس خط میں کوئی قابل ذکر بات تو نہیں ہے۔ سوائے اس کے کہ یہ علامہ شبلی کے قلم سے ہے۔ تاہم اسے یہاں درج کرنا ضروری ہے۔ نواب غلام احمد کلامی کے پاس علی گڑھ سے جو رسائل آتے تھے، ان میں سے کوئی رسالہ نہیں پہنچا تو اس کے لئے انہوں نے سر سید کے ساتھ علامہ شبلی کو بھی خط لکھا۔ اس کے جواب میں علامہ شبلی نے لکھا ہے کہ

جناب من!

میں نے میگزین کے ایک پرچہ میں اشتہار دیدیا ہے کہ مجھ کو پرچوں کے بھیجنے اور بھجوانے سے تعلق نہیں۔ آپ منشی نیاز محمد خاں منیجر کالج میگزین کو تحریر فرمائیں۔ ممکن تھا کہ میں آپ کا والا نامہ ان کو دیدیتا، مگر براہ راست خط و کتابت کا اثر زیادہ ہوگا۔

شبلی

۵ مئی ۱۸۹۶ء(۱۰)

نواب غلام احمد کلامی کی شخصیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ علامہ شبلی نے ان کا نام ندوہ کی مجلس شوریٰ کے ارکان میں داخل کرنے کے لئے پیش کیا اور وہ رکن منتخب ہوئے۔ ندوہ، علی گڑھ کالج، انجمن حمایت اسلام لاہور اور بعض دوسرے اداروں کے بھی وہ رکن اور سرپرست رہے۔ علی گڑھ کالج کے نہ صرف رکن بلکہ فیلو بھی تھے۔ ایجوکیشنل کانفرنس کے بھی وہ رکن تھے اور اس کے اجلاسوں میں شریک ہوتے۔ تحریک خلافت سے بھی انہیں گہرا لگاؤ تھا۔ اس کے اجلاسوں میں وہ شریک رہتے۔ علی برادران اور بی اماں تحریک خلافت کے سلسلہ میں ویلور آئیں تو انہی کے یہاں قیام وطعام رہا۔

۳۔ مشہور عالم ومصنف اور ''تذکرہ علمائے ہند'' کے مصنف محمد عبدالشکور بن حکیم شیر علی صدیقی معروف بہ مولانا رحمٰن علی [۱۸۲۸-۱۹۰۷ء] اور علامہ شبلی ایک دوسرے سے واقف تھے۔ اپنی کتاب تذکرہ علمائے ہند میں ان کے بارے میں لکھا ہے کہ

(۵۰۶) مولوی محمد شبلی اعظم گڑھی

مولوی محمد شبلی اعظم گڑھ، اسکات المعتدی علی انصات المقتدی اور ظل الغمام وغیرہ

کے مصنف ہیں۔ مروجہ درسی کتابیں مولوی محمد فاروق چریا کوٹی سے پڑھیں۔ اب مدرسہ علی گڑھ میں مدرس اول ہیں۔

تصانیف: المامون (تاریخ زمانہ مامون الرشید خلیفہ عباسیہ، بغداد) الجزیہ (جزیہ کی حقیقت کا بیان) گذشتہ تعلیم (مسلمانان سلف کے علوم کی تدوین اور قدیم مدارس کے نام) صبح امید (اسلام کی موجودہ حالت) سیرت النعمان (امام ابوحنیفہؒ کی سوانح عمری) عربی و فارسی قصائد و غزلیات۔(۱۱)

ان دونوں کے درمیان خط و کتابت بھی تھی۔ مولانا رحمٰن علی ایک ہندو ریاست ریواں [مدھیہ پردیش] میں معزز عہدہ پر فائز تھے۔ اس ریاست کا ہندو راجہ نہایت شریف اور معزز شخص تھا۔ ان کا نام ان کے بھائی کے نام امان علی کے وزن پر رحمٰن علی اسی راجہ کا تجویز کردہ ہے۔ اخراجات کے لئے راجہ نے کئی گاؤں مولانا رحمٰن علی کی نذر کئے تھے۔ جس کی آمدنی انہوں نے مساجد کے اخراجات کے لئے وقف کردی تھی۔ ان کا تذکرہ کتاب کے مترجم محمد ایوب قادری [۱۹۲۶-۱۹۸۳ء] نے ''تذکرہ علمائے ہند'' میں کیا ہے۔(۱۲)

خان بہادر مولوی رحمٰن علی جس وقت ''تذکرہ علمائے ہند'' قلم بند کر رہے تھے، علامہ شبلی سے ''جامہ'' کے رواج کے سلسلہ میں معلومات دریافت کی تھیں۔ اس کے جواب میں علامہ شبلی نعمانی نے لکھا کہ

جناب مکرم مولوی رحمٰن علی خاں صاحب دام مجدہ

ممبر کونسل ریاست ریواں تسلیم!

جہاں تک مجھ کو معلوم ہے جامہ (۱۳) کا رواج ہندوستان کے سوا اور کہیں نہ تھا۔ دولت عباسیہ اندلس، اتاترک کے لباس کا حال کتابوں میں ملتا ہے۔ وہ جامہ سے بالکل الگ ہے۔ یہاں اس کا رواج غالبًا اکبر کے عہد سے ہوا۔ لیکن کسی خاص حوالہ کا مجھ کو علم نہیں۔ آپ کی کتاب تذکرۃ العلماء کب تک تیار ہوگی۔

المامون چھپ رہی ہے۔ والسلام

شبلی

۲۶ر نومبر ۱۸۹۰ء (۱۴)

یہ خط پروفیسر غلام مصطفیٰ خاں [۱۹۱۲-۲۰۰۵ء] کومولانا رحمٰن علی مرحوم کے کتب خانہ ریواں میں ملا تھا۔ انہوں نے اس کی نقل مولانا سید سلیمان ندوی کو بھیجی اور اپنے مضامین کے مجموعہ ''علمی نقوش'' کے ایک حاشیہ میں بھی درج کر دیا تھا۔ میں نے وہیں سے نقل کیا ہے۔

ریواں میں مولانا رحمٰن علی کا ایک بڑا قیمتی کتب خانہ تھا۔ جوان کی وفات کے بعد برباد ہو رہا تھا۔ چنانچہ پروفیسر غلام مصطفیٰ خاں نے کوشش کی کہ یہ قیمتی کتب خانہ دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ منتقل ہو جائے۔ سید صاحب کو بھی انہوں نے متوجہ کیا۔ انہوں نے بھی کوشش کی اور ان کے صاحبزادے سے خط و کتابت کی، مگر کامیابی نہ مل سکی۔ (۱۵)

۴۔ مولانا مفتی شیر علی [م: ۱۵ر فروری ۱۹۳۶ء] بڑے عالم و فاضل اور علوم دینیہ پر کمال دسترس رکھنے والے بزرگ تھے۔ ان کا وطن گڑگاؤں تھا۔ اسی ضلع کے ایک موضع ''تر کیا داس'' میں پیدا ہوئے۔ دہلی، رنگون اور ریاست جھجر کے ثقہ علماء سے تحصیل علم کیا۔ مفتی ہدایت اللہ رامپوری اور مفتی عبداللہ ٹونکیؒ ان کے خاص اساتذہ میں ہیں۔ درسیات پر بے پناہ دسترس تھی۔ علامہ شبلیؒ کی خواہش پر وہ ندوہ تشریف لائے اور صدر مدرس مقرر ہوئے۔ ان کی تقرری سے تعلیم و تعلم کا ندوہ میں ایک نیا دور شروع ہوا، مگر وہ جلد ہی واپس حیدر آباد چلے گئے اور وہاں مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ آخر میں جامعہ عثمانیہ حیدر آباد میں علم کلام کے پروفیسر ہو گئے تھے اور یہیں سے قبل از وقت خرابی صحت کی بنا پر وظیفہ لیا۔ ۱۵ر فروری ۱۹۳۶ء کو حیدر آباد میں وفات پائی۔

ندوۃ العلماء کو ترقی دینے اور اس کے تعلیمی معیار کو بلند رکھنے کے لئے علامہ شبلی نے بڑی جدو جہد کی۔ مولانا مفتی شیر علی صاحب سے خط و کتابت اور پھر ان کا تقرر اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ ان کے نام علامہ شبلی کے ۱۴ر خطوط نقوش لاہور کے مکاتیب نمبر میں شائع ہوئے تھے۔ جنہیں راقم اپنی کتاب '' مکتوبات شبلی'' میں شامل کر چکا ہے۔ اب ان کے مزید ۹ر خطوط اور دستیاب ہوئے ہیں۔ جو مذکورہ بالا ۱۴ر خطوط کے ساتھ حیدر آباد سٹی کالج کے ترجمان الموسیٰ [ج ۵ ش ۱-۲] میں شائع ہوئے ہیں۔ ان خطوط کو ان کے نواسے سید عبدالجلیل نے شائع کرایا ہے۔ (۱۶) وہ خطوط درج ذیل ہیں۔

[۱]

یہ فقط رسید ہے، جواب ایک ہفتہ میں عرض کروں گا۔

شبلی، لکھنو

۳؍ستمبر ۱۹۰۹ء

[ماخذ: مجلّہ الموسی، حیدرآباد ج ۱ش ا۔ ۲، ص ۵۸]

[۲]

مولانا!

رمضان میں مدرسہ بند ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک خاص وجہ تھی، یعنی ارکان ندوہ نے ایک اور صاحب کا نام پیش کیا تھا۔ اور مجھ کو ان پر اتمام حجت کرنا تھا۔ میں ان شاءاللہ دو ہفتہ میں قطعی خط لکھ سکوں گا۔

شبلی

۴؍نومبر ۱۹۰۹ء

[ماخذ: مجلّہ الموسی، حیدرآباد، ج ۱ش ا۔ ۲، ص ۵۸-۵۹]

---

[۳]

جناب مولانا مہتمم صاحب

ان دو بچوں کو دارالعلوم میں پڑھنا مقصود ہے۔ امتحان لے کر تعین کر دیا جائے کہ کس کلاس کے قابل ہیں۔ چونکہ بورڈنگ میں جگہ نہیں اس لئے یہ دونوں باہر رہیں گے۔

شبلی

ا؍دسمبر ۱۹۰۹ء

[ماخذ: مجلّہ الموسی، حیدرآباد، ج ۱ش ا۔ ۲، ص ۵۹]

---

[۴]

جنابِ من!

عبدالرحمٰن رنگونی (۱۷) سے دریافت فرمائیے کہ وہ دس بجے آغا خاں صاحب (۱۸) کے پاس گئے تھے یا نہیں؟ اور کیا جواب ملا۔ آغا خاں صاحب کے ہاں سے شاید خود کوئی جواب آیا ہو، دریافت فرما کر لکھئے۔

شبلی۔ ۱ر فروری ۱۹۱۰ء

[ماخذ: مجلّہ الموسیٰ، حیدرآباد، ج ا ش ا۔ ۲، ص ۵۹]

---

[۵]

مولانا!

مجھ کو افسوس ہوا کہ آپ کو بے فائدہ دوا دوش ہوئی، تعطیل مزید کی آپ کو خبر نہیں دی گئی، ورنہ آپ اہل و عیال میں کچھ دنوں اور بسر کر سکتے۔

افسوس بر آورد بن؟ کر نہیں آئی۔ مارچ کا مہینہ گذر گیا تو سرکاری رقم متعلق مولوی طیب صاحب (۱۹) نہ مل سکے گی۔

شبلی

۱۸ر مارچ ۱۹۱۰ء

[ماخذ: مجلّہ الموسیٰ، حیدرآباد، ج ا ش ا۔ ۲، ص ۵۹]

---

[۶]

جناب مولانا!

درخواست رخصت پہنچی، منظور ہو کر درج رجسٹر کی گئی۔ لیکن اب مژدۂ تشریف آوری سے اطلاع دیجئے، ورنہ بہت انتشار ہے۔

شبلی

۷ر جنوری ۱۹۱۱ء

[ماخذ: مجلّہ الموسی، حیدرآباد، ج ۱ش ۱-۲، ص ۶۰]

[۷]

جناب من!

بذریعہ تار مطلع فرمایئے کہ آپ واپس آئیں گے یا نہیں۔

شبلی

[ماخذ: مجلّہ الموسی، حیدرآباد، ج ۱ش ۱-۲، ص ۶۰]

[۸]

تسلیم!

وہ کام ہو گیا، آپ کو تکلیف فرمانے کی ضرورت نہیں۔

شبلی

۱۴/اگست ۱۹۱۳ء

[ماخذ: مجلّہ الموسی، حیدرآباد ج ۱ش ۱-۲، ص ۶۳]

[۹]

مولانا!

میرا ان معاملات میں پڑنا مصلحت نہیں۔

شبلی

۱۳/ستمبر ۱۹۱۳ء

[ماخذ: مجلّہ الموسی حیدرآباد ج ۱ش ۱-۲، ص ۶۳]

یہ خطوط اگرچہ بہت مختصر ہیں اور ان سے بہت کچھ واضح نہیں ہوتا۔ تاہم یہ سوانح شبلی کی

مستقل کڑی نہ ہونے کے باوجود گم شدہ کڑیوں کے ملانے میں ان سے ضرور مدد مل سکتی ہے۔مزید جو۱۴رخطوط''مکتوبات شبلی'' میں شامل ہیں،ان کے ساتھ تسلسل سے ان کا مطالعہ کیا جائے تو ان خطوط کی اہمیت پورے طور پر سامنے آتی ہے۔

مفتی شیر علی کے نام متعدد خطوط ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد میں محفوظ ہیں۔ان کا ذکر ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے اپنی کتاب''تذکرہ نوادر'' میں کیا ہے۔اوران کی جو تفصیل لکھی ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ اس میں چندوہ خطوط بھی شامل ہیں جو اس میں شامل نہیں ہیں۔(۲۰)

ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد سے راقم نے مذکورہ خطوط کے عکس کے لئے کوشش کی،مگر کامیابی نہیں ملی۔

حوالے

(۱) علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۱۰رمارچ ۱۸۹۳ء وحیات شبلی طبع جدید ص ۲۶۴-۲۶۶

(۲) محمڈن نیشنل میگزین سیال کوٹ،یکم اگست ۱۸۹۳ء،ص ۷-۸

(۳) ایضاً ص ۱۰

(۴) محمڈن نیشنل میگزین سیال کوٹ،یکم اگست ۱۸۹۳ء ص ۹-۱۰

(۵) محمڈن نیشنل میگزین سیال کوٹ،یکم اگست ۱۸۹۳ء ص ۱۰

(۶) ایضاً

(۷) سپاس نامہ کا جواب ص ۵-۶

(۸) سپاس نامہ ص ۱۰-۱۶

(۹) نقش ونظر ص ۲۹-۵۷،پروفیسر مظفر علی شہ میری،معراج پبلی کیشن،تروپتی،۱۹۹۸ء

(۱۰) ایضاً ص ۵۷

(۱۱) تذکرہ علمائے ہند،مترجمہ محمد ایوب قادری،مقدمہ ڈاکٹر سید معین الحق،پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی،کراچی،۱۹۶۱ء،ص ۴۳۶-۴۳۷

(۱۲) تذکرہ علمائے ہند ص ۲۳-۲۹

(۱۳) ''جامہ'' کی تفصیل دستیاب نہ ہوسکی۔

(۱۴) پروفیسر غلام مصطفیٰ خاں، علمی نقوش ص ۲۴۴، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۱۹۸۲ء

(۱۵) ایضاً ص ۲۴۴-۲۴۵

(۱۶) مجلّہ الموسی، حیدرآباد ج ا ش ا-۲، ص ۵۸

(۱۷) تفصیل معلوم نہ ہوسکی۔

(۱۸) ہز ہائنس آغا خان، مشہور قومی و سیاسی لیڈر

(۱۹) تفصیل معلوم نہ ہوسکی۔

(۲۰) تذکرہ نوادر ص ۲۲۶-۲۲۸، مرتبہ ڈاکٹر محی الدین قادری زور، ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد

[۵]

سیاسیاتِ شبلی

علامہ شبلی[۱۸۵۷ء-۱۹۱۴ء]عالمی شہرت یافتہ اہل قلم ،عالم وادیب،انشاپرداز،شاعر، مورخ ومحقق ماہرتعلیم اوراپنے عہد کے بلندرتبہ دانشور تھے۔ان کے علمی،ادبی ،قومی اور تاریخی کارناموں کی وجہ سے ان کا شمار عالم اسلام کے نامور مصنّفین اور مفکرین میں ہوتا ہے۔انہوں نے تا حیات علم وادب اورقوم وملت کی خدمت انجام دی۔متعدد اہم اورگراں مایہ تصنیفات وتالیفات ان کی یادگار ہیں۔ان میں الفاروق،المامون،سیرۃ النعمان،موازنہ انیس ودبیر،شعرالعجم اور سیرۃ النبیؐ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔شعرالعجم اور سیرۃ النبیؐ تو ایسی کتابیں ہیں جس کی مثال اردو تو کیا فارسی وعربی زبانوں میں بھی نہیں ملتیں۔

علامہ شبلی کا شمار انجمن ترقی اردو اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کے بانیوں میں ہوتا ہے۔شبلی نیشنل کالج اور دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ انہیں نے قائم کئے۔یہ محض ادارے نہیں بلکہ ان کی فکرونظر کے جلوے ہیں اور یہ ان کے ایسے عظیم الشان کارنامے ہیں جنہیں تاریخ کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔ان کی بدولت ملت کی ذہنی نشوونما اور ترقی ہوئی۔خاص طور پر دارالمصنّفین ایک مایہ ناز علمی مملکت ہے،جس کی نظیر آج بھی نہیں ملتی۔

علامہ شبلی ۴؍جون ۱۸۵۷ء کو ضلع اعظم گڑھ کے ایک گاؤں بندول میں پیدا ہوئے۔ان کی ابتدائی تعلیم وتربیت گھر پر ہوئی۔پھر مزید حصول علم کے لئے مدرسہ چشمہ رحمت غازی پور گئے اور مولانا فاروق چریا کوٹی[م:۲۸؍اکتوبر۱۹۰۹ء] سے تحصیل علم کیا۔اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لئے ان کے والد شیخ حبیب اللہ[م:۱۲؍نومبر۱۹۰۰ء] نے جو اعظم گڑھ کے نامور وکیل تھے۔۱۸۷۳ء میں اعظم گڑھ شہر میں ایک عربی مدرسہ قائم کیا۔جس میں پہلے مولانا فیض اللہ مئوی[م:۱۸۹۸ء]

اور پھر مولانا فاروق چریا کوٹی کو استاذ مقرر کیا۔ چنانچہ علامہ شبلی نے اپنی بقیہ تعلیم کی تکمیل اسی مدرسہ میں مولانا فاروق چریا کوٹی سے کی۔ بعدازاں علوم دینیہ میں مہارت پیدا کرنے کے لئے رام پور، سہارنپور اور لاہور کے سفر کئے اور اس عہد کے ارباب کمال سے تحصیل علم کیا۔ ان میں مولانا ارشاد حسین رامپوری [۸ر جمادی الاخریٰ ۱۳۱۱ھ]، مولانا احمد علی محدث سہارنپوری [۷ر جمادی الاول ۱۲۹۷ھ] اور عربی زبان کے ادیب شہیر مولانا فیض الحسن سہارنپوری [م: ۱۳۰۴ھ/۱۸۸۷ء] کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

مذہبی علوم کی تحصیل کے بعد علامہ شبلی نے وکالت کا امتحان پاس کیا اور کچھ دنوں تک اپنے وطن اعظم گڑھ اور ضلع بستی میں وکالت کی۔ ۱۸۸۳ء میں ایم اے او کالج علی گڑھ میں جگہ نکلی تو اس کے لئے امیدوار ہوئے۔ سرسید احمد خاں [۱۸۱۷-۱۸۹۸ء] نے ان کی علمی جستجو اور شوق مطالعہ و کتب بینی سے متاثر ہو کر ۱۸۸۳ء میں فارسی و عربی کا اسسٹنٹ پروفیسر مقرر کیا۔ علی گڑھ میں انہوں نے ۱۶ر برس تک درس وتدریس کے ساتھ تصنیف و تالیف کا کارنامہ بھی انجام دیا۔ ان کی چند مشہور کتابیں مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم، المامون، سیرۃ النعمان، تاریخ بدءالاسلام اور سفرنامہ روم ومصروشام علی گڑھ ہی کے زمانہ قیام کی یادگاریں ہیں۔ وہ علی گڑھ کالج میں برسوں درس قرآن بھی دیتے رہے۔ علی گڑھ کالج کی ترقی میں ان کا بھی نمایاں اور قابل قدر حصہ ہے۔ اور اس میں تو کوئی شبہ نہیں کہ ایم اے او کالج علی گڑھ میں دینی فضا انہی کی کوششوں کی بدولت قائم ہوئی۔ اس کا خود انہیں احساس تھا۔ چنانچہ ایک خط میں فخریہ اس کا ذکر کیا ہے۔

ان کا شمار علی کالج کے قابل فخر اساتذہ میں ہوتا تھا۔ سرسید احمد خاں کی وفات کے بعد مئی ۱۸۹۸ء میں علی گڑھ کالج کی ملازمت سے مستعفی ہو کر حیدرآباد چلے گئے۔ جہاں انہیں سررشتہ علوم وفنون کا ناظم مقرر کیا گیا۔ اس عہدہ پر وہ چار برس فائز رہے۔ یہاں بھی انہوں نے سررشتہ علوم وفنون کی نظامت کے ساتھ کئی اہم کتابیں سپرد قلم کیں۔ ان میں الکلام، علم الکلام، الغزالی اور سوانح مولانا روم خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

علامہ شبلی نعمانی ابتداء سے قوم پرور خیالات رکھتے تھے۔ چنانچہ ۱۸۸۳ء میں جس سال وہ علی گڑھ کالج سے وابستہ ہوئے اسی سال انہوں نے اپنے وطن اعظم گڑھ میں نیشنل اسکول کی بنیاد

رکھی۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب انڈین نیشنل کانگریس قائم بھی نہیں ہوئی تھی اور اس زمانہ میں نیشنل لفظ کا استعمال انگریزی حکومت سے کسی بغاوت سے کم نہ تھا۔ تاہم علامہ شبلی نے اس کی کچھ پرواہ نہ کی اور کالج کی ملازمت اور تصنیفی مصروفیات کے باوجود نیشنل اسکول کی ترقی کے لئے مسلسل کوشاں رہے۔ اس کی تفصیل ان کے مکاتیب میں موجود ہے۔ ہمارے دوست ڈاکٹر محمد عارف عمری نے نیشنل اسکول سے متعلق ان کی جدوجہد کی داستان ایک مضمون میں لکھی ہے۔ جو شبلی نیشنل کالج میگزین ۹۴-۱۹۹۳ء [ص ۲۷۷-۲۸۲] میں شائع ہوا ہے۔

نیشنل اسکول کے قیام کے دوسال بعد دسمبر ۱۸۸۵ء میں جب کانڈین نیشنل نگریس قائم ہوئی تو علامہ شبلی نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ سرسید احمد خاں [۱۸۱۷-۱۸۹۸ء] اس کو مسلمانوں کے لئے پسند نہیں کرتے انہوں نے کانگریس کی حمایت کی۔ سرسید احمد خاں ہی نہیں خود ان کے والد شیخ حبیب اللہ جو ایک زمیندار تھے اور زمیندارانہ مزاج رکھتے تھے۔ سرسید کے ہم نوا اور ان کی انڈین پیٹریاٹک سوسائٹی کے رکن تھے، وہ بھی کانگریس کو پسند نہیں کرتے تھے، لیکن علامہ شبلی نے قومی مفاد اور اپنے نقطۂ نظر کے مقابلہ میں کسی کی پرواہ نہیں کی اور کانگریس کو دل سے پسند کرتے اور اس کی تحسین وستائش کرتے رہے۔

علامہ شبلی نے ایک خط میں صاف طور پر لکھا ہے کہ میں ۱۶/ برس سرسید احمد خاں کے ساتھ رہا، لیکن ان کے سیاسی نظریہ کا مخالف رہا اور کانگریس کی حمایت کی اور اسے مسلمانوں کے لئے دل سے پسند کرتا رہا۔

ایک بار ایم اے او کالج علی گڑھ میں شخصی اور جمہوری طرز حکومت کے موضوع پر مباحثہ ہوا تو سرسید نے شخصی حکومت کی حمایت کی۔ جبکہ علامہ شبلی نے جمہوری طرز حکومت کی تائید میں مدلل تقریر کی۔ ان کی یہ تقریر اس قدر پر جوش اور مدلل تھی کہ طلبائے علی گڑھ نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ سرسید نے اس موقع پر ان کے جمہوری تصورات کے خلاف نہ صرف تقریر کی بلکہ ۲۸/ اپریل ۱۸۹۲ء کے انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں اس کے خلاف مضمون بھی لکھا۔ سرسید نے اسی موقع پر علامہ شبلی سے کہا تھا کہ رات جب تک میں نے آپ کا جواب نہیں لکھ لیا نیند نہیں آئی۔

علامہ شبلی جمہوریت کے ساتھ ہندو مسلم اتحاد کے بھی بڑے زبردست حامی اور داعی

تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب مسلم فرقہ پرستی کی لے تیز ہوئی اور ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ قائم ہوئی تو علامہ شبلی نے اس کے اصول ونظریات اور طریق کار پر سخت تنقیدیں کیں۔ان کی یہ منظوم تنقیدیں مولانا ابوالکلام آزاد [۱۸۸۸-۱۹۵۸ء] کے اخبار الہلال کلکتہ اور مولانا ظفر علی خاں [۱۸۷۳-۱۹۵۶ء] کے زمیندار لاہور اور بعض دوسرے رسائل وجرائد میں شائع ہوئیں۔علامہ شبلی مسلم لیگ کے خیالات کو ہندوستانی مسلمانوں کے لئے مضر خیال کرتے تھے۔مسلم لیگ کے خلاف انہوں نے جو نظمیں لکھی ہیں وہ ان کے کلیات میں موجود ہیں اور ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ مسلم لیگ نے اپنے اندر جو اصلاحات اور مفید تبدیلیاں کیں، وہ بڑی حد تک علامہ شبلی کی تنقیدات ہی کا نتیجہ تھیں۔

علامہ شبلی اصلاً ایک مخالف انگریز تھے اور ہندوستان میں ان کی حکومت کو سخت ناپسند کرتے تھے اور وقتاً فوقتاً ان پر ڈھکے چھپے نقد کیا کرتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ انگریزی حکومت بھی ان کے خلاف ہوگئی تھی۔اس اختلاف کا سب سے پہلا اظہار اس وقت ہوا جب وہ ۱۸۹۲ء میں قسطنطنیہ اور روم ومصروشام کے سفر سے واپس آئے۔قسطنطنیہ میں ان کی بڑی پذیرائی ہوئی تھی اور خلیفہ سلطان عبدالحمید خاں [۱۸۴۲-۱۹۱۸ء] کی طرف سے انہیں ''تمغہ مجیدیہ'' سے نوازا گیا تھا۔اس لئے انگریزوں نے انہیں شبہہ کی نگاہ سے دیکھا۔مولوی عبدالرزاق کان پوری [۱۸۷۴-۱۹۴۸ء] نے لکھا ہے کہ انہوں نے علامہ شبلی کے سفرنامہ روم ومصروشام پر تبصرہ لکھا جو کان پور کے کسی اخبار میں چھپا تو کان پور کے انگریز کلکٹر نے انہیں طلب کر کے سرزنش کی اور کہا کہ تم برطانیہ کی رعایا ہو کر سلطان روم کی تعریف کرتے ہو۔چنانچہ انہیں اس تبصرے کے لئے معذرت کرنی پڑی۔(۱)

علامہ شبلی کو ترکوں سے ابتدا سے بے پناہ محبت تھی۔۱۸۷۷ء کی روم وروس جنگ کے موقع پر انہوں نے اعظم گڑھ میں چندہ کر کے تین ہزار کی رقم ترکی سفیر حسین حبیب آفندی مقیم بمبئی کے ذریعہ ترکی بھیجی تھی۔ چونکہ علامہ شبلی اتحاد اسلامی کے داعی تھے۔اس لئے سفر قسطنطنیہ کے بعد انگریزی حکومت نے انہیں شیخ محمد عبدہ کے نظریہ اتحاد اسلامی کا نمائندہ خیال کیا اور تمغہ مجیدیہ کے استعمال کی اجازت نہیں دی۔بعدازاں اسے سرقہ کرادیا۔اس موقع پر جب انگریزی حکومت کی نیت صاف نہیں تھی، ان کے محسن اور بزرگ سرسید احمد خاں آڑے آئے اور انہوں نے حکومت کو

لکھا کہ ہمارے کالج میں ایک ایسا عالم وفاضل شخص ہے جسے ترکی حکومت نے ''تمغہ مجیدیہ'' عطا کیا ہے، لیکن ہماری حکومت اس سے صرف نظر کرتی ہے۔ ضرور ہے کہ ان کو شمس العلماء کا خطاب دیا جائے۔ چنانچہ سرسید احمد خاں کی یہ سفارش کام آئی اور حکومت نے انہیں ۱۸۹۴ء میں شمس العلماء کے خطاب سے سرفراز کیا۔ یہاں یہ بات لائق ذکر ہے کہ اس اعزاز سے مولوی نذیر احمد اور مولانا حالی کو علامہ شبلی کے بعد انگریزی حکومت نے نوازا۔

اس اعزاز کی خوشی میں ایم اے او کالج علی گڑھ میں ایک تہنیتی تقریب منعقد ہوئی۔ جس میں کالج کے طلبہ واساتذہ کے ساتھ عمائدین نے بھی شرکت کی۔ اس تقریب میں علامہ شبلی تعریف وتحسین میں متعدد تقریریں ہوئیں اوران کی خدمات کا ذکر رہا، مگر علامہ شبلی اس کے بعد بھی اپنے قوم پرور جذبات وخیالات کے اظہار سے باز نہیں آئے اور وقتاً فوقتاً اس کا اظہار کرتے رہے۔ علی گڑھ کالج کی ایک تقریب میں جس میں انگریز افسر بھی شریک تھے، انہوں نے ایک قصیدہ پیش کرتے ہوئے جب یہ شعر پڑھا:

نوجوانو! یہ حریفوں کو دکھا دینا ہے
اپنی قوت کو کیا قوم نے یکجا کیسا

تو بے ساختہ ان کی انگلی انگریزوں کی طرف اٹھ گئی۔ چہ میگوئیاں شروع ہوئیں اور پھر بات حکومت تک پہنچ گئی اور انگریزی حکومت ان پر کڑی نظر رکھنے لگی۔ حتیٰ کہ ان کے پیچھے جاسوس لگا دیئے گئے۔(۲) اور یہی وجہ ہے کہ مئی ۱۸۹۸ء میں انہوں نے علی گڑھ کی ملازمت ترک کر کے حیدرآباد کا رخ کیا اور کئی برس تک وہاں سررشتہ علوم وفنون کی نظامت کرتے رہے۔ اس دور میں علی گڑھ کی زمام کاران کے دوست نواب محسن الملک [۱۸۳۶-۱۹۰۷ء] کے ہاتھ آ گئی تھی۔ علامہ شبلی کے حیدرآباد جانے میں اگرچہ ان کا مشورہ بھی شامل تھا، تاہم نواب صاحب علامہ شبلی کو دوبارہ علی گڑھ بلانا چاہتے تھے۔ اس لئے انگریز گورنر سے مل کر ان کے بارے میں جو شکوک وشبہات تھے انہیں رفع کیا۔ چنانچہ انہیں اجازت مل گئی کہ علامہ شبلی نعمانی کو علی گڑھ بلالو۔ مگر علامہ شبلی حیدرآباد سے علی گڑھ کے بجائے ندوۃ العلماء لکھنو سے وابستہ ہوگئے۔ گو نواب محسن الملک نے انہیں ندوہ جانے سے بہت روکا اور اس کے مضمرات سے بھی آگاہ کیا، لیکن چونکہ علامہ شبلی ندوہ کی تعمیر وترقی کو اپنی بقیہ

زندگی کا نصب العین قرار دے چکے تھے، اس لئے نہ مانے اور ندوہ آ گئے۔

علامہ شبلی کے ندوہ آنے سے پہلے انگریزی حکومت ندوہ سے بھی بدظن تھی اور اس پر نگاہ رکھتی تھی، مگر علامہ شبلی ندوہ آئے تو انہیں خیال پیدا ہوا کہ اب شاید دونوں قابو میں آ جائیں۔ چنانچہ علامہ شبلی نے ندوہ کی تعمیر کے لئے حکومت کو ایک قطعہ آراضی کی درخواست دی، جو منظور ہوئی اور پھر ندوہ کا افتتاح بھی گورنر کے ہاتھوں انجام پایا۔ اس کے باوجود علامہ شبلی نے اپنے قوم پرور خیالات کی اشاعت جاری رکھی۔ مولانا ابوالکلام آزاد [۱۸۸۸-۱۹۵۸ء] جن سے علامہ شبلی کے عرصہ سے گہرے مراسم تھے اور جو ان سے بے حد متاثر تھے، وہ علامہ شبلی کی خواہش پر ندوہ آ گئے اور چند ماہ ندوہ میں ان کے ساتھ قیام کر کے الندوہ کی ادارت کی۔ اس زمانہ میں ان کے دو اور تلامذہ مولانا محمد علی جوہر کامریڈ اور ہمدرد کے ذریعہ اور مولانا ظفر علی خاں دکن ریویو اور زمیندار کے ذریعہ قوم پرور جذبات اور انگریزوں کی استبدادی حکومت کے خلاف اپنے اپنے طور پر کوشاں رہے۔ یہی نہیں یہ دونوں ہندوستان میں اتحاد اسلامی کے بھی بڑے ہم نوا تھے۔ جو اصلاً علامہ شبلی ہی کا ایک خواب تھا۔ علامہ شبلی ڈھکے چھپے ان کی سرپرستی کرتے رہتے تھے۔ اسی زمانہ میں علامہ شبلی نے مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی اور مولانا ضیاء الحسن علوی وغیرہ کی تصنیف و تالیف کے لئے ندوہ اور ماہنامہ الندوہ کے ذریعہ تربیت کی اور وہ نامور عالم اور اہل قلم ہوئے۔ حکومت کی ان سب امور پر نظر تھی۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے ''حیات شبلی'' میں لکھا ہے کہ کم از کم ۱۹۱۱ء تک انگریزی حکومت ان پر شبہہ کرتی اور ان سے خائف رہی۔ تاہم واقعہ یہ ہے کہ وہ اپنی وفات ۱۸/ نومبر ۱۹۱۴ء تک مسلسل اپنے خیالات کے سبب احرار کے سرخیل بنے رہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت پورے ہندوستان میں وہ واحد مسلمان عالم و دانشور تھے جو قوم پرور مسلمانوں کو ذہنی و فکری غذا فراہم کرتے رہے۔ یہی وہ دور ہے جس میں انہوں نے مسلم لیگ کو اپنی شدید تنقیدوں کا نشانہ بنایا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا اخبار الہلال کلکتہ اس وقت احرار کا سب سے بڑا ترجمان اور اتحاد اسلامی کا علم بردار تھا، جس میں علامہ شبلی کی مسلم لیگ اور لیگیوں پر تنقیدیں کبھی اصلی اور کبھی کشاف وصاف کے فرضی ناموں سے چھپتی تھیں۔ اس زمانہ میں علامہ شبلی نے کئی سیاسی مضامین بھی لکھے۔ آرمینیا پر ان کا مضمون اسی دور کی یادگار ہے۔ اس سلسلہ کا ان کا سب سے طویل، مدلل

اور معرکتہ الآراء مضمون ''مسلمانوں کی پولٹکل کروٹ'' ہے۔ جس نے بقول مولانا سید سلیمان ندوی مسلمانوں کی سیاست کا رخ شملہ سے قبلہ کی طرف پھیر دیا۔(۳)

اس مقالہ میں علامہ شبلی نے مسلمانوں کو سیاسی امور میں حصہ لینے کے لئے ابھارا ہے اور جو اس میدان کارزار میں موجود تھے ان کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ اس مقالہ میں انہوں نے دوقومی نظریہ کو مسترد کیا ہے اور ہندو مسلم اتحاد پر خاص طور پر زور دیا ہے۔ حالانکہ اس وقت تک دوقومی نظریہ باقاعدہ نظریہ کے طور پر سامنے بھی نہیں آیا تھا اور نہ مسلمان دو دھڑوں میں منقسم ہوئے تھے۔ اسی پرزور مقالہ میں مسلم لیگ اور نواب وقار الملک [۱۸۴۱-۱۹۱۷ء] کے اس نقطہ نظر کی کہ ''ہم نیشنل کانگریس میں شریک ہو جائیں گے تو ہماری ہستی اسی طرح برباد ہو جائے گی، جس طرح معمولی دریا سمندر میں مل کر سما جاتے ہیں۔'' علامہ شبلی نے سختی سے تردید کی اور لکھا کہ

> ''اگر پارسیوں کی قوم ایک لاکھ کی جماعت کے ساتھ ہندؤں کے ۱۹ر کروڑ اور مسلمانوں کے ۵ر کروڑ افراد کے مقابلہ میں اپنی ہستی قائم رکھ سکتی ہے۔ اگر دادا بھائی نوروزجی تمام ہندوستان کے مقابلہ میں سب سے پہلے پارلیمنٹ کا ممبر ہو سکتا ہے۔ اگر گوکھلے تنہا ریفارم اسکیم کی عظیم الشان تحریک کی بنیاد ڈال سکتا ہے تو ۵ر کروڑ مسلمانوں کو اپنی ہستی کے مٹ جانے کا اندیشہ نہیں کرنا چاہئے۔''(۴)

اس مقالہ میں مسلمانوں کی سیاسی بیداری کے ذکر کے ساتھ علامہ شبلی نے ان رہنماؤں پر شدید نقطہ چینی کی ہے، جنہوں نے مسلمانوں کو سیاست سے دور رہنے کے مشورے دئے تھے۔ ان میں خاص طور سے انہوں نے سرسید پر نقد کیا ہے اور سیاسیات میں ان کی رائے کو بے وزن بھی ثابت کیا ہے۔ البتہ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس سیاسی تبصرے اور تجزیے میں کہیں کہیں خود علامہ کی لے بہت تیز وتند اور جذباتیت کی حد میں داخل ہوگئی ہے۔ قومیت اور جمہوریت کی حمایت اور ہندو مسلم اتحاد جس میں وہ کامیابی کا خواب دیکھ رہے تھے اور ان کی کامیابی دراصل قوم پرور خیالات کی اشاعت اور ہندو مسلم اتحاد کے ذریعہ انگریزوں پر برتری حاصل کرنے کی کوشش کے سوا کچھ نہ تھی، اس میں وہ حد اعتدال سے متجاوز ہو گئے۔ چنانچہ علامہ شبلی کے خلاف فیض آباد اور بعض دوسرے شہروں میں مظاہرے ہوئے اور ان پر ہندؤں کی بیجا طرفداری کا الزام عائد کیا گیا۔

علامہ شبلی نے اپنے مضمون کی بعد کی اقساط میں اس کی وضاحت کی اور لکھا کہ میرا مقصد کسی کی طرف داری نہیں، بلکہ ہندو مسلم اتحاد اور یگانگت کے جذبات کا برانگیختہ کرنا اور حقائق کو واضح کرنا تھا اور یہ دکھانا مقصود تھا کہ ماضی میں وہ متحد ہو کر رہ چکے ہیں جواب بھی ممکن ہے اور ناممکن نہیں۔

علامہ شبلی کو اپنے عہد کا گہرا سیاسی شعور تھا اور اسی شعور سے انہوں نے نئی نسل کے متعدد ارباب سیاست وبصیرت کی رہبری اور رہنمائی کی۔ واقعہ یہ ہے کہ پہلی جنگ عظیم کے بعد ہندوستانی سیاست میں جن نیشنلسٹ مسلمانوں نے تحریک آزادی میں نمایاں کردار ادا کیا ان میں بیشتر علامہ شبلی سے متاثر یا تلامذہ تھے۔

علامہ شبلی اگر ۱۹۱۴ء کی پہلی جنگ عظیم کے بعد زندہ رہے ہوتے تو یقینی ہے کہ امام الہند مولانا ابو الکلام آزاد، مولانا ظفر علی خاں اور مولانا محمد علی جوہر اور ان کے ہم نواؤں نے تحریک آزادی میں جو کردار ادا کیا وہ خود اس کے سب سے بڑے علم بردار ہوتے اور ان کی قیادت بھی وہی کرتے۔ سید طفیل احمد منگلوری نے سچ لکھا ہے کہ

> ''عجیب بات ہے کہ جب سے مسلمان فرقہ وارانہ سیاست سے نکل کر عام ملکی سیاست میں داخل ہوئے قدیم تعلیم یافتگان کا حصہ اس میں نمایاں ہوگیا، بلکہ انہوں نے مسلمانوں کو فرقہ پرستی کے دلدل سے نکالنے میں خاص کام کیا، جس میں سب سے اول مولانا شبلی تھے۔'' (۲)

بہر حال یہ حقیقت ہے کہ علامہ شبلی ہندوستان کی جدوجہد آزادی کے بالکل ابتدائی دور میں نہ صرف قومیت، جمہوریت، اتحاد اسلامی، بلکہ ہندو مسلم اتحاد کے بھی داعی اول تھے۔ تقسیم ہند کے ستر سال بعد آج یہی نقطہ نظر آئین ہند کا فخر وناز ہے۔ بلکہ دنیا بھر میں ہندوستان کی عزت و عظمت اور سر بلندی کا راز اسی جمہوری نقطہ نظر میں پنہاں ہے۔ گو وہ اس وقت سخت حملوں کی زد پر ہے، تاہم یقین ہے کہ وہ اپنی بنیادی خصوصیات کی بنا پر فسطائیت پر غالب آجائے گا۔

حوالے

(۱) حیات شبلی ص ۱۵۵، مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، طبع جدید ۲۰۱۵ء

(۲) ایضاً

(۳) ایضاً ص ۱۷۵

(۴) مقالات شبلی ج ۸ ص ۱۴۵-۱۴۶، سید سلیمان ندوی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، طبع جدید، ۲۰۱۰ء

(۵) سید طفیل احمد منگلوری، مسلمانوں کا روشن مستقبل ص ۳۷۷، کتب خانہ عزیزیہ دہلی ۱۹۴۵ء

(اعظم گڑھ مہوتسوا سمارکا۔ ۲۰۱۹ء)

OOO

[۶]

علامہ شبلی کے چند منتخب اشعار

علامہ شبلی نعمانی[۱۸۵۷-۱۹۱۴ء] نے اردو، فارسی اور عربی تینوں زبانوں میں دادِ سخن دی ہے۔عربی میں محض چند اشعار اور سر سید احمد خاں[۱۸۱۷-۱۸۹۸ء] کی شان میں ایک قصیدہ ان کی کل کائنات ہے۔عربی قصیدہ سے سر سید احمد خاں اس قدر متاثر ہوئے کہ اسے اپنے اخبار علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں شائع کیا۔لیکن علامہ کا اصل میدان شاعری اردو و فارسی ہے۔ان دونوں زبانوں میں ان کے متعدد مجموعے مجموعہ نظم شبلی، دیوان شبلی، دستہ گل، بوئے گل، برگ گل، کلام شبلی اور نالہ شبلی وغیرہ شائع ہوئے۔ان کی وفات کے بعد مولانا سید سلیمان ندوی[۱۸۸۴-۱۹۵۳ء] نے ان کا اردو و فارسی کلیات شائع کیا۔

ادبی مورخین اور نقادوں نے علامہ شبلی کی فارسی شاعری کو اہل زبان کے کلام سے تشبیہ دی ہے، اور اردو کلام میں ان کی اخلاقی اور سیاسی شاعری کو ان کی ایجاد و اختراع کا نام دیا ہے۔اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان کی شاعری کا کثرت سے مطالعہ و تجزیہ پیش کیا گیا ہے اور متعدد مضامین ومقالات کے علاوہ مستقل کتابیں بھی لکھی گئی ہیں۔لیکن ابتک ان کے کلام کا کوئی انتخاب منظر عام پرنہیں آیا۔اردو کی تاریخ میں انتخاب کلام کی ایک قدیم اور مضبوط روایت قائم رہی ہے۔بعد کے زمانہ میں اردو اکادمیوں نے ایک نیا انتخابی سلسلہ شروع کیا تھا، جس میں ہر چھوٹے بڑے شاعر کا انتخاب شائع کیا، مگر علامہ شبلی دور جدید کے اس سلسلہ انتخاب شعر میں بھی جگہ نہ پا سکے۔

گذشتہ دنوں الیاس احمد رٹائرڈ ڈسٹرکٹ جج کے دو انتخابات ''بہار'' اور گلہائے پریشاں'' مطالعہ میں آئے۔بہار ۱۹۳۴ء میں مولانا عبدالسلام ندوی[۱۸۸۳-۱۹۵۶ء] کے دیباچہ کے ساتھ معارف پریس اعظم گڑھ سے شائع ہوا ہے۔جبکہ دوسرا انتخاب'' گلہائے پریشاں'' ۱۹۵۷ء میں شائع ہوا۔یہ ۴۸۶ رصفحات پر مشتمل ہے۔لیکن مزید کوئی تفصیل درج نہیں۔

الیاس احمد صاحب کے بارے میں میرے پاس کسی قسم کی معلومات نہیں ہیں اور تلاش بسیار کے باوجود ان کی سوانحی تفصیلات نہ مل سکیں۔ مثلاً وہ کہاں پیدا ہوئے اور کہاں کے رہنے والے تھے۔ تعلیم کہاں سے حاصل کی اور کن کن عہدوں پر فائز رہے۔ وفات کہاں ہوئی۔ ان کے وارث کون لوگ ہیں۔ البتہ گلہائے پریشاں کے مفصل دیباچے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ غالباً لکھنو کے رہنے والے تھے۔ ثاقب لکھنوی[۱۸۶۹-۱۹۴۶ء] سے ان کے گہرے مراسم تھے۔ دیباچہ میں ان کا ذکر متعدد جگہوں پر اس طرح کیا ہے گویا وہ ان ساتھ ہوں۔ ایک عبارت سے یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ علی گڑھ کالج کے تعلیم یافتہ تھے۔ ان کی اسناد ایم اے، ایل ایل بی، پی جے ایس کا ذکر ''بہار'' کے سرورق سے ملتا ہے۔ ملازمت سے سبکدوشی کے بعد ان کا قیام سہارن پور میں تھا۔ ان کے علاوہ کچھ قیاسی معلومات بھی نہیں۔ ہاں انہوں نے بہار اور گلہائے پریشاں کے دیباچوں میں اپنے ادبی ذوق کے بارے بہت سی معلومات فراہم کردی ہیں۔ مثلاً انہیں زبان وادب بالخصوص اردو و فارسی شاعری سے عشق تھا۔ وہ دواوین کا کثرت سے مطالعہ کرتے تھے۔ جج کے عہدہ یعنی غیرادبی مشاغل کے باوجود ان کا ادبی ذوق انہیں ہندوستان کے مشہور اور غیر معروف کتب خانوں تک لے گیا اور انہوں نے دواوین کا گہرائی سے اور کثرت سے مطالعہ کیا۔ لیکن ان باتوں کے علاوہ وہ اپنی سخن فہمی کا ذکر بھی انتہائی سادگی اور انکساری سے کرتے ہیں۔ انہیں وہ شہرت نہیں ملی جس کے وہ مستحق تھے، تاہم ایسا رویہ انہوں نے شعوری طور پر اختیار کیا۔ البتہ وہ اپنی غزل پرستی کا اعلان بہت واضح طور پر کرتے ہیں۔ اس انتخاب میں انہوں نے اردو شاعری کے قدیم و جدید موضوعات پر انتہائی عمدہ اشعار کا انتخاب کیا ہے۔ اور ایسا عمدہ انتخاب کیا ہے کہ اس میں اردو و فارسی شاعری کا عطر آ گیا ہے۔ اس میں اردو و فارسی کے تمام بڑے شعرا کا کلام جگہ پا گیا ہے۔ اس انتخاب میں علامہ شبلی کے بھی چند اشعار منتخب ہو گئے ہیں اور یہی انتخاب اس مختصر سے مضمون کا باعث بنا ہے۔

گلہائے پریشاں میں الیاس احمد نے علامہ شبلی کے جن اشعار کو منتخب کیا ہے۔ زیرنظر مضمون میں انہی کو موضوع کے لحاظ سے یکجا کیا گیا ہے۔ پہلے موضوع دیا گیا ہے اور یہ موضوع خود مرتب الیاس احمد صاحب کا طے کردہ ہے۔ البتہ گلہائے پریشاں اور کلیات شبلی سے اس کا مقابلہ

راقم نے کیا ہے اوران دونوں کا حوالہ بھی دیدیا ہے۔ جہاں ضرورت محسوس ہوئی ہے وہاں وضاحتی نوٹس بھی لکھے گئے ہیں اور فارسی وارد و دونوں کے منتخب اشعار علاحدہ علاحدہ دئے گئے ہیں۔ پہلے فارسی بعدازاں اردو اشعار درج کئے گئے ہیں۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ مرتب نے شعرالعجم سے بہت کچھ فائدہ اٹھایا ہے اور اس کا ذکر بھی کیا ہے۔ مثلاً انہوں نے لکھا ہے کہ علامہ شبلی نظامی کی غزلیات کے قائل نہ تھے، مگر پھر بھی لکھتے ہیں کہ ''انہیں بوڑھے غمزوں میں کبھی کبھی بڑے شوخ جملے بھی زبان سے نکل جاتے ہیں۔(گلہائے پریشاں ص۸۳)بعدازاں انہوں نے نظامی کا شعر نقل کیا ہے۔ وہ شعر یہ ہے:

بوسہ می خواہم ازاں لب تو چہ می فرمائی　　گر صواب است بگو ورنہ خطائے بکنم

یہ شعر نقل کر کے الیاس احمد صاحب نے یہ نوٹ لگایا ہے کہ ''یہ برجستہ اور باموقع شعر سن کر نادرشاہ نرم ہوا اور تلوار میان میں رکھ کر کہا ''بخشیدم'' (ایضاً ص۱۱۴)

بہت سے اہل علم نے یہ اعتراف کیا ہے کہ شعرالعجم نے شعروادب کا ایک مذاق پیدا کیا۔ یہ اس کی ایک ادنیٰ مثال ہے۔

فارسی اشعار

۱۔موضوع: دل

از دل صد پارہ ات آگہ نیم شبلی ولے　　شیشہ دیدم کہ از بالائے طاق افتادہ بود

گلہائے پریشاں ص۴۲　　کلیات شبلی فارسی ص۵۹

۲۔موضوع: قد یار

سنجیدہ ایم فتنہ محشر بہ قامتش　　یک نیزہ قد فتنہ طرازش بلند بود

گلہائے پریشاں ص۵۵　　کلیات شبلی فارسی ص۴۷

۳۔موضوع: انکار وصل

حرف انکار ز خوباں ہمہ از دل نبود　　گہ گہ ایں کار بہ آئین حیا نیز کنند

گلہائے پریشاں ص۱۱۴　　کلیات شبلی فارسی ص۸۶

۴۔موضوع: رحم والتفات ووفا

بہ سویم چوں نظر افتاد ووش آں ترک پرفن را بگفت ایں خستہ جاں جائے گرفتاراست پنداری

گلہائے پریشاں ص۱۲۴ کلیات شبلی فارسی ص۶۰

۵۔موضوع: پرسش

یارے می پرسید شبلی را کہ چوں برباد رفت مشت خاکے درہوا پیشش پریشاں کردہ ام

گلہائے پریشاں ص۱۲۷ کلیات شبلی فارسی ص۶۶

۶۔موضوع: بدگمانی

باما بہ ہر معاملہ بدگماں نبود خوش بود آں کہ راز محبت عیاں نبود

گلہائے پریشاں ص۱۲۸ کلیات شبلی فارسی ص۸۱

۷۔موضوع: راز ونیاز

چشمش بسوئے ما نگہ ناتمام کرد ساقی بجام ریخت مئے نارسیدہ را

گلہائے پریشاں ص۱۶۶ کلیات شبلی فارسی ص۷۷

۸۔موضوع: نوائے عاشق

یا جگر کاوی آں نشتر مژگاں کم شد یا کہ خود زخم مرا لذت آزار نماند

گلہائے پریشاں ص۱۹۰ کلیات شبلی فارسی ص۸۰

۹۔موضوع: گونا گونی

فرض کردم کہ بزلفش نہ فروشم دل ودیں در بغارت برو آں نرگس فتاں چہ کنم

دیوان میں اس شعر کے مصرعہ اول میں فرض کردم کی جگہ خودگرفتم ہے۔

گلہائے پریشاں ص۲۱۱ کلیات شبلی فارسی ص۵۶

۱۰۔موضوع: کفر وایماں

دودل بودن دریں رہ سخت ترعیبی است سالک را خجل ہستم ز کفر خود کہ دارد بوئے ایماں ہم

گلہائے پریشاں ص۲۹۸ کلیات شبلی فارسی ص۲۷

اس شعر کی زبردست داد مولانا حالی نے علامہ شبلی کو دی تھی اور یہ بھی لکھا تھا کہ میراارادہ تھا

کہ اپنا فارسی کلام شائع کراؤں مگر ''دستہ گل'' دیکھنے کے بعد میری غزلیں خود میری نظر سے گر گئیں۔
(حیات شبلی ص۸۰۶)

۱۱۔موضوع: نوائے رند

منبر و محراب درس عشق را شائستہ نیست شرح اسرار نہاں بردار می بایست کرد

گلہائے پریشاں ص۲۶۱ کلیات شبلی فارسی ص۷۹

یہ بھی علامہ شبلی کے منفرد اشعار میں سے ایک ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ عشق و محبت معمولی چیز نہیں۔اس کے لئے منبر و محراب موزوں جگہ نہیں ہیں، بلکہ اس کا اصل مقام دار و رسن ہے۔ جہاں سے شہیدان محبت کی حقیقی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔

اردو اشعار

۱۲۔موضوع: یاد ماضی

غنچہ گل کا تبسم تھا ہر اک دم برق ریز
عندلیبوں کی زباں پر نالہ مستانہ تھا
نشہ آور تھی نگاہ مست ساقی اس قدر
خود بخود لبریز مے ہر ساغر و پیمانہ تھا
اب نہ وہ صحبت نہ وہ جلسے نہ وہ لطف سخن
خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

گلہائے پریشاں ص۲۴۷ نوادرات شبلی ص۲۱۸

۱۳۔موضوع: رقیب

جمع کر لیجئے غمزوں کو مگر خوبی بزم بس وہیں تک ہے کہ بازار نہ ہونے پائے

گلہائے پریشاں ص۳۰۸ نوادرات شبلی ص۲۱۷

۱۴۔موضوع: وطن

گو بہت کچھ رنج یاران وطن سے تھا مگر آنکھ میں آنسو و لے وقت سفر آ ہی گیا

گلہائے پریشاں ص۳۸۲

علامہ شبلی کی جو اردو غزلیں نوادرات شبلی میں جمع کی گئی ہیں ان میں یہ شعر نہیں ملا۔

۱۵۔موضوع: مضمون خط

اعتبار آپ کو نہ آئے گا　　کیا کہوں اپنے اشتیاق کا حال

گلہائے پریشاں ص۳۹۳۔

یہ شعر بھی ''نوادرات شبلی'' میں ایک اضافہ ہے۔

۱۶۔موضوع: ہستی ونیستی

بزم ہستی میں مرے پیش نظر کیا کیا نہ تھا　　دیکھتے ہی دیکھتے لیکن جو دیکھا کچھ نہ تھا

گلہائے پریشاں ص۴۵۴

یہ شعر بھی اردو کلام شبلی میں ایک اضافہ ہے۔

اردو کے جو تین اشعار نئے مل گئے ہیں اور جو علامہ شبلی کی اردو غزلوں میں شامل نہیں ہیں ان کے بارے میں راقم کا خیال ہے کہ چونکہ اس زمانہ میں جب الیاس احمد صاحب منصف کتب خانہ دارالمصنّفین سے مستفید ہو رہے تھے، اس وقت علامہ شبلی کی ''بیاض'' غالباً وہاں محفوظ تھی۔ ممکن ہے اسی بیاض سے انہوں نے ان اشعار کو نقل کیا ہو۔ چونکہ وہ بیاض اب دستیاب نہیں اس لئے اس کی تصدیق وتوثیق نہیں کی جا سکتی۔ البتہ جب تک کسی ذرائع سے اس کی تکذیب نہیں ہوتی یہ اشعار علامہ شبلی ہی کے نام منسوب رہیں گے۔

ان چند منتخب اشعار سے اہل ذوق علامہ شبلی کی شاعرانہ عظمت کا ایک انداز لگا سکتے ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ چند موضوعاتی اشعار ہیں۔ علامہ کی اصل شاعری کا نمونہ نہیں۔ اس لئے ایک انتخاب کی ضرورت بہر حال باقی ہے۔ اور اس کے لئے ہماری نظر بجا طور پر دارالمصنّفین کے ڈائرکٹر پروفیسر اشتیاق احمد ظلی صاحب کی طرف جاتی ہے۔ امید ہے محترم ظلی صاحب قدر دانان شبلی کو مایوس نہیں کریں گے اور یہ ضروری کام پایہ تکمیل کو ضرور پہنچے گا۔ ان شاء اللہ

[۷]

کلام شبلی پر تضمین۔ایک مطالعہ

علامہ شبلی نعمانی[۱۸۵۷-۱۹۱۴ء] کی اردو شاعری کی طرف توجہ ذرا کم دی گئی۔ بلکہ ابتداء میں تو سرے سے نظر انداز ہی کر دیا گیا تھا۔ نقادوں نے ادبی مورخین کے اس غیر منصفانہ رویے کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔تب بعض ادبی مورخین اور نقادوں نے علامہ شبلی کو شاعر کی حیثیت سے تسلیم کیا اور اپنی ادبی تاریخوں اور تحریروں میں جگہ دی۔ حالانکہ علامہ شبلی نے تقریباً ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔اس کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں۔ چونکہ خود علامہ شبلی کا سارا زور نثر نگاری کی طرف رہا اور ان کے تمام عظیم الشان کارنامے نثر ہی میں ہیں،اس لئے لوگوں کی توجہ ادھر مبذول نہ ہو سکی۔ دوسرے یہ کہ خود علامہ شبلی نے اپنی اردو شاعری کو اس قدر اہمیت نہیں دی، جس قدر فارسی شاعری کو وہ دیتے رہے۔اسے خود انہوں نے بھی وقتی جذبات کا نتیجہ قرار دیا۔لیکن جیسا کہ مولانا حسرت موہانی[۱۸۷۸-۱۹۵۱ء] نے لکھا ہے کہ آخر عمر میں انہیں اپنی اردو شاعری کی اہمیت کا احساس ہو گیا تھا اور وہ چاہتے تھے کہ ان کی سیاسی اور اخلاقی نظموں کا مجموعہ علاحدہ شائع کیا جائے۔حالانکہ ان کی زندگی ہی میں بعض ظالم ناشروں نے چوری چھپے ان کا کلام شائع کر لیا تھا اور خوب منافع بھی کمایا۔

علامہ شبلی کی وفات کے بعد متعدد ناشرین نے ان کے کلام کے کئی مجموعے یکے بعد دیگرے شائع کئے۔مولانا سید سلیمان ندوی[۱۸۸۴-۱۹۵۳ء] نے ان سب کو ناقص قرار دے کر ایک اور مجموعہ شائع کیا اور اسے ''کلیات شبلی'' کا نام دیا۔مگر ایک لحاظ سے سید صاحب کا مرتبہ کلیات بھی نامکمل ہے۔اس میں علامہ شبلی کی اردو غزلیں شامل نہیں کی گئی ہیں۔اس طرح ایک اور مجموعہ کلام کی ترتیب و تدین کا کام ابھی باقی ہے جو جدید اصول و آداب تحقیق و تدوین نو کے مطابق

ہوااوراس میں وہ کلام بھی شامل ہو جو''کلیات شبلی'' کی اشاعت کے وقت مولانا سید سلیمان ندوی کے پیش نظر نہیں تھا اور جو بعد میں دریافت ہوا اور جو ماہنامہ معارف اور بعض دوسرے رسائل میں شائع ہوا ہے۔اس کے علاوہ بھی متعدد کتب ورسائل میں علامہ شبلی کی تخلیقات شائع ہوئی تھیں، جنہیں جہاں تک ممکن تھا راقم نے''نوادرات شبلی''میں یکجا کردیا ہے۔''نوادرات شبلی''۲۰۱۷ء میں ادبی دائرہ سے شائع ہوکر مقبول ہوچکی ہے۔مغربی بنگال اردو اکیڈمی کولکاتا نے اسے اپنے معزز ایوارڈ''جان گل کرسٹ ایوارڈ''سے سرفراز کیا ہے۔

علامہ شبلی کی اردو شاعری بھی بڑی طرحدار اور بڑی خوبیوں کی حامل ہے۔اہل ذوق نقادوں کا ایک بڑا طبقہ اس کی بھرپور افادیت کا قائل ہے۔پروفیسر آل احمد سرور[۱۹۱۱-۲۰۰۲ء] اگرچہ اسے کبھی کبھی کی موج قرار دیتے ہیں،تاہم ان کبھی کبھی کی موجوں کی بے کرانی کا بھی اعتراف کرتے ہیں۔خاص طور پر ان کی اخلاقی اور سیاسی شاعری کی اثر آفرینی سے تو شاید ہی کسی صاحب ذوق کو انکار ہوگا۔دراصل ان کی حریت فکر نے ان کی شعری اثر آفرینی میں بے حد اضافہ کردیا تھا۔یہی وجہ ہے کہ ان کے دور آخر میں ہر سمت ان کی سیاسی نظموں کا طوطی بولتا تھا۔مولانا حسرت موہانی نے سچ لکھا ہے کہ

> ''علامہ شبلی کے نتائج افکار زیادہ تر فارسی زبان میں ہیں،لیکن آخر عمر میں سیاسی واخلاقی بحث پر ان کے جو چند قطعات نقاد،کشاف اور وصاف کے نام سے الہلال میں چھپے ہیں، ان سے اردو ادب کی کتاب میں گویا ایک نئے باب کا اضافہ ہوگیا ہے۔لاریب پختگی کلام، برجستگی مضمون،آزادی خیال،ندرت بیان اور نوطرز غرض کہ ہر حیثیت سے یہ قطعی اپنا آپ جواب ہیں اور کچھ عجب نہیں کہ غالب کے اردو کلام کے مانند رفتہ رفتہ شبلی کی بھی اردو شاعری ان کی فارسی شاعری پر غالب آجائے۔لٹریچر کے مانند مذہب اور پالیٹکس میں بھی مرحوم کا مذاق نہایت صحیح واقع ہوا تھا۔جس کی جھلک ان کی ہر سیاسی اور اخلاقی نظم میں پائی جاتی ہے۔''(۱)

بلند ذوق سخن سنجی کے ساتھ علامہ شبلی ایک بڑے سخن فہم اور سخن شناس بھی تھے۔اس کے متعدد واقعات ان کے سوانح نگاروں نے لکھے ہیں اور اس سے بھی بڑھ کر ان کی سخن فہمی کی شہادت

موازنہ اور شعر العجم کے صفات میں روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ سید الاحرار مولانا حسرت موہانی نے علامہ شبلی کی اس خوبی کا بھی ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ

> ''سخن فہمی اور سخن سنجی دونوں کے لحاظ سے علامہ شبلی کی ذات بلا مبالغہ بے مثل اور بے نظیر تھی۔ لاریب اس وقت ہندوستان کا کوئی شاعر شاعری کا صحیح مذاق رکھنے کے اعتبار سے علامہ شبلی سے برتر بلکہ ان کے برابر ہونے کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔ فارسی اور اردو کے لاتعداد اشعار آپ کو یاد تھے۔ جن کی خوبی کا سرٹی فکیٹ یہ تھا کہ شبلی نے ان کو یاد رکھنے کے قابل سمجھا۔ ارباب بینش کو آپ کی سخن فہمی کے حیرت انگیز کرشمے موازنہ انیس و دبیر اور شعر العجم کے صفحوں میں اب بھی نظر آسکتے ہیں۔'' (۲)

مولانا حسرت موہانی کی پیشین گوئی سچ ثابت ہوئی اور علامہ شبلی کی شاعری کی طرف بھر پور توجہ دی گئی اور اب بھی دی جارہی ہے۔ جہاں اس سے گرمی محفل کا ساماں ہوا، وہیں دلوں میں جوش اور ولولہ پیدا کرنے کے بھی وہ کام آئی اور اس کی طرف اس قدر توجہ دی گئی کہ پچاسوں مقالات شائع ہوئے۔ اس کے تعارف وتجزیے پر مستقل کتابیں لکھی گئیں۔ اور پی ایچ ڈی کے لئے بھی کئی مقالے لکھے گئے اور ہنوز یہ سلسلہ جاری ہے۔ تاہم علامہ شبلی کی شاعری کے بہت سے پہلو اور گوشے اب بھی ایسے نکل آتے ہیں جن کا مطالعہ باقی ہے۔ جیسے ان کی نظم نگاری، قطعہ نگاری، مثنوی، مرثیہ اور قصیدہ نگاری وغیرہ اصناف پر بحیثیت مجموعی نقادوں نے اظہار تو خیال کیا ہے۔ البتہ اہم نظموں یا مثنوی اور قصاید وغیرہ کا علاحدہ بالتفصیل جائزہ نہیں لیا جاسکا ہے۔

کلیات شبلی اردو کی اشاعت پر صدی گذرنے والی ہے۔ مگر ابتک اس کی جدید ترتیب و تدوین اور فرہنگ کی طرف توجہ نہیں کی جاسکی ہے۔ کلام شبلی کے اعلام واشخاص کے مطالعہ کی طرف بھی ابتک کسی اہل قلم کی توجہ نہیں ہوئی تھی اور راقم بے بضاعت کا خیال تھا کہ کوئی عالم وفاضل شخص یہ کام انجام دے تو زیادہ بہتر طور پر حق ادا ہوگا اور زیادہ وقیع کام سامنے آئے گا، مگر بالآخر مجھ ہی کو یہ کام بھی انجام دینا پڑا۔ جسے ادبی دائرہ نے حال ہی میں کتابی صورت میں شائع کر دیا ہے۔

علامہ شبلی کی اردو شاعری بالخصوص ان کی اخلاقی اور سیاسی منظومات اور قطعات نے بڑی مقبولیت پائی۔ بعض قصاید اور شہر آشوب اسلام وغیرہ تو اپنے عہد میں بے حد مقبول تھے۔ سانحہ

مسجد کانپور پر ان کے قطعات ایک زمانہ میں بچہ بچہ کی زبان پر تھے اور گویا وہ ملت کا رجز بن گئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس سے ہمارے اہل علم اور ارباب دین ودانش بالخصوص شعراء نے خاصی دلچسپی لی۔ اس دلچسپی کا ایک سبب ان کی تضمین نگاری بھی ہے۔ انہوں نے اپنی مثنوی، قصاید اور قطعات میں بہت سے شعرا کی تضمین کی ہے اور اس قدر خوب صورت انداز میں کی ہے گویا وہ شعر اسی جگہ کے لئے کہا گیا ہو۔ تضمین کے سلسلہ کی ایک دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ اکثر انہوں نے اردو نظموں میں فارسی اشعار کی تضمین کی ہے۔ اور وہ بھی اس قدر برمحل کہ ارباب ذوق داد دئے بنا نہ رہ سکیں۔ مثلاً مثنوی صبح امید کا آخری شعر

سرگذشت عہد گل راہم زشبلی می شنو
عندلیب آشفتہ تر گفت ست ایں افسانہ را

یہ شعر فارسی کے مشہور شاعر نظیری نیشاپوری[م:۱۶۱۲ء] کا ہے۔ علامہ شبلی نے محض ان کے تخلص کی جگہ اپنا تخلص شامل کر کے شعر کو مثنوی کا حصہ بنا دیا ہے۔(۳) اسی طرح ایک نظم ''جنگ یورپ اور ہندوستان''میں جس کا مطلع ہے:

اک جرمنی نے مجھ سے کہا از رہے غرور
آساں نہیں ہے فتح تو دشوار بھی نہیں

اس میں غالب کا یہ مشہور شعر شامل ہے:

اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

علامہ شبلی نعمانی کی اردو شاعری کے اس پہلو کا تفصیلی جائزہ اب نہیں لیا جا سکا ہے۔ ڈاکٹر شیخ عقیل احمد ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی نے اپنی کتاب ''فن تضمین نگاری: تنقید و تجزیہ''میں علامہ شبلی کی تضمینات کا ذکر ضرور کیا ہے اور اس کی کئی مثالیں بھی دی ہیں۔(۴) تاہم اب بھی ایک مفصل تجزئے کی ضرورت بوجوہ باقی ہے۔

خود علامہ شبلی کے کلام پر متعدد شعراء نے تضمین کی ہے، جس کے تعارف و تجزئے کی طرف بھی غالباً ابتک کسی اہل قلم کی توجہ نہیں ہو سکی ہے۔ حالانکہ تضمین کرنے والوں میں اردو کے

بعض بڑے نامور شعراء کا نام بھی شامل ہے۔

علامہ شبلی اوران کے لازوال کارناموں پر انہیں جو منظوم خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے، یہ ان سے علاحدہ ایک الگ چیز ہے۔ راقم اس سلسلہ کی متعدد منظومات وتضمینات کو اپنی کتاب ''شبلی سخنوروں کی نظر میں'' یکجا کر کے اپریل ۲۰۱۲ء میں شائع کرا چکا ہے۔ اس کے بعد بھی متعدد نظمیں دستیاب ہوئی ہیں۔ جن میں علامہ شبلی کی شخصیت اور فکری بصیرت و بصارت کا ذکر موجود ہے۔ اس میں متعدد تضمینات بھی ہاتھ آئی ہیں۔ اس میں مسلم عظیم آبادی [۱۸۸۸-۱۹۷۷ء]، پروفیسر محمد یونس خالد بزمی [۱۹۳۲-۱۹۹۹ء] سراج الدین خاں سائل دہلوی [۱۸۶۴-۱۹۴۵ء]، نور لدھیانوی [۱۹۰۲-۱۹۶۷ء] اور کیفی اعظمی [۱۹۱۸-۲۰۰۲ء] کے نام قابل ذکر ہیں۔ مسلم عظیم آبادی کی تضمین علامہ شبلی کی ایک فارسی غزل پر فارسی ہی میں ہے اور خاصی وقیع ہے۔

یوں تو ہر شاعر نے اچھی تضمین کی ہے اور معیار و وقار کا بڑا پاس ولحاظ رکھا ہے۔ تضمین میں عموماً سطحیت راہ پا جاتی ہے، مگر علامہ شبلی کے کلام پر تضمین کرنے والوں نے سطحیت اور پھکڑ پن نہیں آنے دیا ہے۔ کیفی اعظمی کی تضمین ''مژدہ'' خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ ان کی تضمین میں شگفتگی کے ساتھ عزم و حوصلہ کے عناصر پورے طور پر موجود ہیں۔ کیفی اعظمی کی تضمین کو بعض لوگوں نے علامہ شبلی کا جواب قرار دیا ہے۔ دراصل یہ ان کی نارسائی کا نتیجہ ہے۔ اصلاً یہ نظم فکر شبلی کی ایک توسیع ہے۔ مثلاً علامہ شبلی کے ''شہر آشوب اسلام'' کا یہ مشہور شعر کہ

حکومت پر زوال آیا تو پھر نام ونشاں کب تک
چراغ کشتہ محفل سے اٹھے گا دھواں کب تک

لیکن کیفی اعظمی مرحوم کہتے ہیں:

زوال ملت اسلامیہ کے نوحہ خواں شبلی
مبارک ہو کہ کروٹ لے رہا آسماں شبلی
مٹائے گا ہمارا کون اب نام ونشاں شبلی
دھواں گرما چکا اڑنے کو ہیں چنگاریاں شبلی

اسی شہر آشوب اسلام کا ایک اور شعر ہے:

یہ مانا قصہ غم سے تمہارا جی بہلتا ہے
سنائیں تم کو اپنے درد دل کی داستاں کبتک

اس پر کیفی اعظمی کا ردعمل دیکھئے:

وہ گل شعلہ بنے جن پر ستم کروٹ بدلتا تھا
وہ رات آخر ہوئی جس میں چراغ ظلم جلتا تھا
ہمارا قصہ غم سن کے جن کا جی بہلتا تھا
قریب ختم آپہنچی انہیں کی داستاں شبلی

ان دونوں تخلیقات میں جو بنیادی فرق ہے وہ یہ کہ ایک غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ماحول میں قلم بند کی گئی ہے۔جبکہ دوسری آزادی کی خوب صورت چھاؤں میں وجود میں آئی ہے۔دوسرا شاعر چندسال پہلے پیدا ہوا ہوتا یا چندسال اورزندہ رہتا تو شاید اس کی شاعری کا رخ بھی بدل جاتا۔حالات کا جبر انسانی نظریات پر شاید سب سے زیادہ انداز ہوتے ہیں۔اور اس لئے بھی کہ زمانہ کا ستم ایک بار پھر کروٹ لے رہا ہے اور جن ہاتھوں نے قبائے زنداں چاک کی تھی انہیں ہاتھوں کو پس دیوار زنداں دیکھنے کا جذبہ پھر ایوان ستم میں پیدا ہو گیا ہے۔

ان کے علاوہ ایک دوسرے تضمین نگار پروفیسر محمد یونس خالد بزمی نے علامہ شبلی کی مشہور نظم جو ''کلیات شبلی'' میں ''خیر مقدم ڈاکٹر انصاری'' کے نام سے شامل ہے، اس پر تضمین کی ہے۔ علامہ شبلی کا بہت مشہور شعر ہے۔

عجب کیا ہے یہ بیڑا غرق ہوکر پھر اچھل آئے
کہ ہم نے انقلاب چرخ گردوں یوں بھی دیکھے ہیں

پروفیسر خالد بزمی نے اسے یوں شعر کے سانچے میں ڈھالا ہے:

اگر بدقسمتی سے وقت کے ماتھے پہ بل آئے
مرے ہمدم تری آنکھوں سے کیوں آنسو نکل آئے
وہ صبح امن و اطمینان جس کے منتظر تھے ہم
وہ آج آئی نہیں تو عین ممکن ہے کہ کل آئے

علامہ شبلی کے شہر ''آشوب اسلام'' پر حال ہی میں ایک اور تضمین دستیاب ہوئی ہے۔ یہ دبستان دہلی کے ایک مشہور شاعر ابوالمعظم سراج الدین خاں سائل دہلوی [۱۸۶۴-۱۹۴۵ء] کی کاوش ہے۔ انہوں نے علامہ شبلی کے مسدس کے جواب میں مخمس لکھا ہے اور یہ مخمس سادگی، سنجیدگی اور متانت و وقار کے لحاظ سے تو ایک قابل ذکر تضمینی تخلیق ہے ہی، شاعرانہ اصول و نظریات کے لحاظ سے بھی ایک قابل ذکر تخلیق ہے۔ وہی دہلوی آداب، رکھ رکھاؤ، فکر و فن کی بلندی اور وضع داری کے پہلو اس میں دکھائی دیتے ہیں، جس کے لئے دبستان دہلی معروف ہے۔ علامہ شبلی کا ''شہر آشوب اسلام''، جس طرح طویل ہے، اسی طرح یہ تضمین بھی خاصی طویل ہے۔

علامہ شبلی اور سائل دہلوی ایک دوسرے سے واقف اور آگاہ تھے۔ خواجہ حسن نظامی [۱۸۷۶-۱۹۵۵ء] کے نام علامہ شبلی کے ایک خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ دونوں میں گہرے اور بے تکلفانہ مراسم تھے۔ علامہ شبلی نے ندوہ کے سالانہ جلسہ میں خواجہ حسن نظامی اور بعض دوسرے احباب کو شرکت کی دعوت دی۔ غالباً سائل دہلوی کا ذکر کرنا بھول گئے۔ تو خواجہ صاحب نے انہیں یاد دلایا۔ اس کے جواب میں علامہ نے لکھا کہ ''سائل صاحب آپ کے نہیں بلکہ میرے ہیں۔ میں نے دانستہ ان کو تکلیف نہیں دی۔ بہرحال ان کو آج لکھتا ہوں۔'' (۵)

سائل دہلوی خانوادہ مرزا غالب [۱۷۹۷-۱۸۶۹ء] کے ایک فرد نواب ضیاء الدین خاں نیر کے پوتے اور نواب شمس الدین خاں کے صاحبزادے تھے۔ ان کا شمار حلقہ داغ کے ممتاز شعراء میں ہوتا ہے۔ علامہ شبلی جس زمانہ میں حیدر آباد کے سر رشتہ علوم فنون کے ناظم کے عہدہ پر فائز تھے۔ نواب مرزا داغ [۱۸۳۱-۱۹۰۵ء] بھی اس وقت دولت آصفیہ سے وابستہ تھے، اور سائل دہلوی مشق سخن کے لئے ان کی صحبت میں وہیں مقیم تھے۔ داغ کی محفلوں میں علامہ شبلی شریک بھی ہوتے تھے۔ دونوں میں غالباً وہیں یعنی حیدر آباد میں ربط ضبط قائم ہوا۔

سائل دہلوی کی تضمین عہد شبلی کی یادگار ہے۔ اور علی گڑھ کے رسالہ ماہنامہ اولڈ بوائے فروری ۱۹۱۳ء کے شمارے میں شائع ہوئی ہے۔ یقیناً علامہ شبلی کی نظر سے بھی گذری ہوگی اور واقعہ یہ ہے کہ بڑی سنجیدہ، متین تضمین ہے اور اس میں وہی سماں پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے، جس ماحول اور پس منظر میں علامہ شبلی نے اپنی نظم کہی ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو:

[۱]

دعائے عافیت مانگے گا دین خستہ جاں کبتک
مخالف گردشیں کرتا رہے گا آسماں کبتک
سنائے گا بتا اے کوکب نامہرباں کبتک
حکومت پر زوال آیا تو پھر نام ونشاں کبتک
چراغ کشتہ محفل سے اٹھے گا دھواں کبتک

[۲]

سمجھ کر یہ کہ یورپ بھر کے اندر ناتواں ہیں ہم
سمجھ کر یہ کہ بیمار و نزار و نیم جاں ہیں ہم
سمجھ کر یہ گھڑی ساعت کے گویا میہماں ہیں ہم
سمجھ کر یہ دھندلے سے نشان رفتگاں ہیں ہم
مٹاؤ کے ہمارا اس طرح نام ونشاں کبتک

[۳]

قضا کے ہاتھ میں تھا انتظام فتح ایوبی
وگرنہ ہم کہاں اور انصرام فتح ایوبی
نہ لو تیرہ صدی کے بعد نام فتح ایوبی
کہاں تک لوگے ہم سے انتقام فتح ایوبی
دکھاؤ گے ہمیں جنگ صلیبی کا سماں کبتک

یہ تضمین اس عہد میں خاصی پسند کی گئی تھی۔

نور لدھیانوی [۱۹۰۲-۱۹۶۷ء] لدھیانہ پنجاب کے ایک ممتاز شاعر وادیب تھے۔ ان کے دو شعری مجموعے ''گلدستہ نور'' اور ''نغمات نور'' شائع ہوئے۔ انہوں نے افسانے، ڈرامے اور غیر افسانوی نثر بھی لکھی ہے۔ ان کے افسانوں کے کئی مجموعے شائع ہوئے۔ لیکن ان کی اصل شہرت اور ناموری ان کی شاعری کی بدولت قائم ہوئی۔

نورلدھیانوی بلا کے ذہین شخص تھے، مگر شاعری سے ایسا شغف ہوا کہ سب کچھ اسی کی نذر کر دیا۔ انہوں نے متعدد نظمیں اور غزلیں کہی ہیں، بلکہ تقریباً ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کے نمونے ان کے مجموعہ کلام میں نظر آتے ہیں۔ اسی طرح ان کا ایک میدان تضمین نگاری بھی ہے۔ بلکہ اس معاملہ میں وہ اپنے معاصرین میں خاصے ممتاز نظر آتے ہیں۔ انہوں نے شبلی و اقبال کی متعدد اور دیگر شعراء کی ایک ایک دو دو نظموں پر تضمین کی ہے۔ سب سے زیادہ حکیم الامت علامہ اقبال [۱۸۷۷-۱۹۳۸ء] کے کلام پر تضمین ان کے مجموعہ کلام ''نغمات نور'' میں شامل ہے۔ علامہ شبلی کی تین مشہور نظموں پر انہوں نے طبع آزمائی کی ہے۔ ان کے مطالعہ کے بعد کہا جا سکتا ہے کہ حق تو انہوں نے ادا ہی کیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ غضب کی شوخی اور دلچسپی پیدا کی ہے۔

علامہ شبلی کی ایک اور بہت مشہور نظم ''عدل جہاں گیری'' ہے۔ یہ اپنے زمانہ میں بے حد مقبول ہوئی اور آج بھی اہل ذوق کی زبان پر ہے۔ بلکہ مخالف کو خاموش کرنے کے لئے کافی خیال کی جاتی ہے۔ نورلدھیانوی نے اس تضمین کو سات حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ بطور مثال اس کے دو حصے یہاں نقل کئے جاتے ہیں۔ البتہ قارئین سے علامہ شبلی کی نظم اور نورلدھیانوی کی تضمین دونوں کے یکجا مطالعہ کی گذارش کی جاتی ہے۔ یہاں بطور نمونہ چند بند نقل کئے جاتے ہیں۔

[۱]

تھے شہنشاہ جہاں گیر رعایا پرور
اور رکھتے تھے وہ انصاف پسندانہ نظر
ہیبت شاہ سے تھراتے تھے دیوارودر
قصر شاہی میں کہ ممکن نہیں غیروں کا گذر
ایک دن نور جہاں بام پہ تھی جلوہ فگن

[۲]

سچ تو یہ ہے نہیں مٹ سکتا تھا مقدر کا لکھا
ہونا ہوتا ہے جو وہ ہو کے ہے آخر رہتا
بام پہ سیر میں جب محو تھی وہ ماہ لقا

کوئی شامت زدہ رہ گیر ادھر آنکلا
گرچہ تھی قصر پہ ہر چار طرف سے قدغن

[۳]

بام سے بام فلک تک تھا عجب نظارہ
جس طرح چودہویں کا چاند ہو جلوہ آراء
آنکھ اٹھا کر جو لگا دیکھنے وہ بے چارا
غیرت حسن سے بیگم نے طپنچہ مارا
خاک پر ڈھیر تھا اک کشتہ بے گور وکفن

دوسرا حصہ

رہ گئے تھام کے دل دیکھنے والے یکسر
جمع ہونے لگے راہ گیر سر راہ گذر
ہوا اس بات سے آگاہ جو ہر فرد وبشر
ساتھ ہی شاہ جہاں گیر کو بھی پہنچی خبر
غیظ سے آگئی ابروئے عدالت پہ شکن

مقطع:

نور انصاف نے اعجاز دکھائے کیا کیا
بیگم شاہ کجا ، جرم کجا ، حکم کجا
شاہ پھر فرط محبت سے جو بیتاب ہوا
دفعتاً پاؤں پہ بیگم کے گرا اور کہا
تو اگر کشتہ شدی آہ چہ کردم من

(نغمات نور ص ۲۷-۳۴)

''عدل جہاں گیری''ہی کی طرح ''عدل فاروقی'' بھی علامہ شبلی کی بہت شاندار اور مقبول ترین نظم ہے۔ نور لدھیانوی نے اسے بھی تضمین کے مرحلہ سے گذارا ہے۔ نظم طویل ہے تو اس کی

تضمین بھی طویل ہوگئی ہے۔نمونہ درج ذیل ہے:

خم ہوئے پاس ادب سے پئے تسلیم سبھی
منتظر سننے کو احکام تھے مردان جری
کہنے پائے بھی نہ تھے آپ کوئی بات ابھی
ایک نے اٹھ کے کہا ہم نہیں مانیں گے کبھی
کہ تیرے عدل میں ہم کو نظر آتا ہے فتور

اور جب فتور عدل کی وضاحت ہوگئی اس کے بعد کا منظر ملاحظہ ہو:

ہوگا منصف کوئی تجھ جیسا کہاں اے فاروقؓ
تیری توصیف ہو کس طور بیاں اے فاروقؓ
تھا سراپا ہی غلط وہم وگماں اے فاروقؓ
نکتہ چیں نے یہ کہا اٹھ کے کہ ہاں اے فاروقؓ
حکم دے ہم کو کہ اب ہم اسے مانیں گے ضرور

چونکہ شاعر نے ہر مصرعے پر تضمین کی ہے،اس لئے یہ تضمین خاصی طویل ہوگئی ہے۔تاہم اس کے مطالعہ کا اصل لطف اور تسکین ذوق کا سامان بھی پوری نظم کے یکجا مطالعہ ہی میں مضمر ہے۔

علامہ شبلی کی تیسری نظم جسے نور لدھیانوی نے تضمین کے لئے منتخب کیا ہے،وہ ہے''ایثار کی اعلیٰ ترین نظیر''۔بلاشبہہ یہ نہ صرف علامہ شبلی کی بلکہ اردو زبان کی چند ممتاز ترین نظموں میں سے ایک ہے۔ملاحظہ ہو:

آغاز

جوش میں آگئے جس وقت مسلمان غیور
پھر تو ہونے لگے پامال ستم گر مغرور
اور کچھ بن نہ پڑی ان کو تو ڈالا یہ فتور
کردیا کافروں نے جنگ احد میں مشہور
کہ پیمبر بھی ہوئے کشتۂ شمسیر دودم

آخری تضمین

تجھ پہ قربان میری جان بھی اور سر بھی فدا
جادہ وحشمت بھی فدا مال بھی اور زر بھی فدا
تجھ پہ فرزند جگر بند بھی دختر بھی فدا
میں بھی اور باپ بھی شوہر بھی برادر بھی فدا
اے شہ دیں تیرے ہوتے کیا چیز ہیں ہم

۱۹۱۳ء میں علامہ شبلی کو بادل ناخواستہ ندوہ کو خیر باد کہنا پڑا تو انہوں نے طلبہ کو مخاطب کر کے یہ قطعہ کہا تھا کہ

کئے تھے ہم نے بھی کچھ کام جو کچھ ہم سے بن آئے
یہ قصہ جب کا ہے باقی تھا جب عہد شباب اپنا
اور اب تو سچ یہ ہے جو کچھ امیدیں ہیں وہ تم سے ہیں
جواں ہو تم لب بام آچکا ہے آفتاب اپنا

ایک صدی بعد نوجوان اہل قلم اور شاعر و ادیب شاہ اجمل فاروق ندوی نے طلبائے ندوہ کی طرف سے علامہ شبلی کو یہ یقین دلایا ہے کہ

کریں گے ہم بھی اب کچھ کام جو کچھ ہم سے بن آئیں
ابھی تو عمر ہے باقی ہے اور عہد شباب اپنا
ہے وعدہ حضرت شبلی کی روح پاک سے اجمل
کریں گے جہد جب تک ڈھل نہ جائے آفتاب اپنا

یہ تازہ تضمینی کلام اس بات کی دلیل ہے کہ علامہ شبلی نے نہ صرف نسلوں کو متاثر کیا بلکہ اثر انگیزی کا یہ سلسلہ ہنوز کسی نہ کسی نوع سے جاری ہے۔ یقین ہے آئندہ بھی یہ شمع روشن رہے گی۔

غرض علامہ شبلی کی نظمیں عوام وخواص کے سوا شعراء وادباء کے درمیان بھی دلچسپی کا مرکز رہیں۔ یہ نظمیں اپنی تاریخی حیثیت کے سوا تضمین نگاری کے لحاظ سے بھی منفرد درجہ رکھتی ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ علامہ اقبال کے سوا اردو ادب میں شاید ہی کوئی ایسا نظم نگار ہوگا جس کی نظموں کی اس

قدر اہتمام سے تضمین کی گئی ہو اور اسی بلند فکر و خیال اور اسی بحر و عروض میں طبع آزمائی کی گئی ہو، جس میں علامہ شبلی نے کی تھی۔

حوالے

(۱) حسرت موہانی، تذکرۃ الشعراء ص ۵۹۴-۵۹۵۔ اردو اکادمی، لکھنو

(۲) ایضاً ص ۵۹۸

(۳) کلیات شبلی اردو ص ۸۹

(۴) فن تضمین: تنقید و تجزیہ۔ ڈاکٹر شیخ عقیل احمد، ساقی بک ڈپو دہلی، ۲۰۰۱ء

(۵) محمد الیاس الاعظمی، مکتوبات شبلی ص ۱۷۱۔ ادبی دائرہ اعظم گڑھ، ۲۰۱۲ء

ooo

[۸]

اردو شارٹ ہینڈ اور علامہ شبلیؒ

علامہ شبلی نعمانی[۱۸۵۷-۱۹۱۴ء] کی سیرت وشخصیت اور کارناموں میں بڑا تنوع ہے۔ ۱۹۴۳ء میں ضخیم ''حیات شبلی'' کی اشاعت کے بعد بھی اس میں گاہے ماہے اضافہ ہوتا رہا ہے۔ ماہنامہ معارف اور بعض دوسرے رسائل میں اس نوع کی متعدد تحریریں شائع ہوئی ہیں۔ گذشتہ دنوں حیات شبلی کا ایک اور ورق دریافت ہوا۔ ۲۷/مارچ ۱۹۱۲ء کو کرسچین کالج لکھنو میں اردو شارٹ ہینڈ کلاس کے طلبہ کا تیسرا سالانہ جلسہ منعقد ہوا تھا۔ جس میں علامہ شبلی بھی شریک ہوئے تھے اور نہایت فصیح وبلیغ تقریر کی تھی۔ اس جلسہ کی صدارت انسپکٹر جنرل پولیس مسٹر ولسن ایم سٹریٹ (Wilson M. Strait) نے کی تھی۔ پروفیسر ایم ایل گھوش جنہیں اردو شارٹ ہینڈ کا بانی خیال کیا جاتا ہے اجلاس کے روح رواں تھے۔ انہوں نے اردو شارٹ ہینڈ کے موضوع پر تقریر کی۔ پروفیسر ایم ایس برانچ نے منیجر کی حیثیت سے رپورٹ پیش کی۔ مرزا ہادی رسوا[۱۸۵۷-۱۹۳۱ء] بھی شریک جلسہ تھے۔ اس موقع پر شارٹ ہینڈ کے طلبہ نے اپنی فنی دلچسپی کا مظاہرہ پیش کرتے ہوئے مقررین کی تقریریں شارٹ ہینڈ کے ذریعہ محفوظ کیں اور پھر پڑھ کر سنائیں۔ اجلاس کی رپورٹ کے ساتھ تقریر کے دو اقتباسات ۱۷/اپریل ۱۹۱۲ء کے زمیندار لاہور میں نقل ہوئے ہیں۔

پہلا اقتباس مسٹر ولسن ایم سٹریٹ کا ہے۔ انہوں نے اپنی صدارتی تقریر میں فرمایا۔

> ''فن شارٹ ہینڈ عملی دنیا کی مشین کا ایک ضروری پرزہ بنتا جا رہا ہے اور امور سیاست اور دیگر معاملات دنیاوی کی انجام دہی کے لئے بہت ہی مفید اور کارآمد ہے اور میں بہت خوش ہوں کہ ہماری گورنمنٹ نے اس طریقہ شارٹ ہینڈ کو پسند کیا ہے۔ آپ حضرات مجھ سے اتفاق کریں گے کہ جو آزمائش اس فن کی آج ہم سب کے سامنے کی

گئی وہ قابل اطمینان ہے اور میں امید کرتا ہوں کہ مولانا شبلی بھی اقرار کریں گے۔ گو
ان کی تقریر نہایت فصیح تھی، لیکن طلبائے شارٹ ہینڈ نے اس کو بہت ہوشیاری سے قلم
بند کیا اور نہایت خوبی سے پڑھ کر سنایا۔'' (۱)

دوسرا اقتباس علامہ شبلی کی تقریر کا ہے، جو اس لحاظ سے بے حد اہمیت رکھتا ہے کہ اس میں ''اردو شارٹ ہینڈ'' کے منفرد موضوع پر اظہار خیال کیا ہے اور جس کا ان کی سوانح میں کہیں ذکر نہیں ملتا۔ علامہ شبلی کے ملکہ خطابت اور'' خطبات شبلی'' پر متعدد تحریریں شائع ہوئی ہیں، مگر ان میں بھی اس خطبہ اور جلسہ میں شرکت کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ علامہ شبلی فرماتے ہیں۔

''اگر چہ یہ فن (شارٹ ہینڈ) ہر زمانہ میں نہایت مفید و فائدہ رساں ہے لیکن آج کل کے زمانہ میں جو کہ یورپ کی تہذیب اور تمدن کا زمانہ ہے یہ فن صرف فائدہ رساں ہی نہیں بلکہ نہایت ضروری ہے اور بغیر اس کے آج کل کی تہذیب و تمدن کا ساتھ نہیں دیا جا سکتا۔ چونکہ ہر قسم کے خیالات کے اظہار و ترقی و اشاعت کا دار و مدار ہے فن تقریر پر اور تقریروں سے وہی لوگ فائدہ اٹھا سکتے ہیں جو کہ وہاں موجود ہوتے ہیں اس لئے مقرروں کے خیالات سے تمام پبلک کو فائدہ پہنچانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ان کی تقریر قلم بند کی جائے اور اس مقصد کو شارٹ ہینڈ ہی پورا کر سکتا ہے، اس لئے وہ بے انتہا مفید ہے۔ پس ہندوستان کی تاریخ میں شارٹ ہینڈ کا قائم مقام ہونا اردو کا ایک خاص نیا باب ہے۔ میری تقریر جو کہ میں نے طبی کانفرنس میں کی تھی، اس فن کے ماہرین نے قلم بند کیا تھا اور میں نے دیکھا تھا کہ میری تقریر اور (شارٹ ہینڈ) میں بہت ہی کم فرق تھا۔ علاوہ پولیس کے لوگوں کے اور لوگ مثلاً اخبار کے رپورٹر اور ارباب قلم اگر اس فن کو سیکھنا چاہیں تو انہیں موقع دیا جانا چاہیے اور کوئی فیس مقرر ہونی چاہیے گو وہ بہت گراں ہو۔ اس کامیابی پر میں تمام طلبا کو اور مسٹر گھوش کو جو اس فن کے بانی ہیں اور اپنے معزز دوست مرزا ہادی صاحب اور پریزیڈنٹ صاحب کو مبارک باد دیتا ہوں۔''(۲)

اس خطبہ سے اردو شارٹ ہینڈ کی افادیت کے ساتھ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ علامہ شبلی کسی

طبی کانفرنس میں شریک ہوئے تھے اور اس موقع پر انہوں نے جو تقریر کی تھی اسے شارٹ ہینڈ والوں نے نقل کیا تھا، مگر جہاں تک مجھے علم ہے اس تقریر کا ذخیرۂ شبلیات میں کہیں ذکر نہیں ملتا ہے۔

اسی طرح علامہ شبلی لکھنو کے زمانہ قیام میں تکمیل الطب کالج لکھنو کے بعض اجلاسوں میں شریک ہوئے اور خطاب بھی کیا، مگر وہ خطبات بھی ابتک دستیاب نہیں ہوئے ہیں۔ بہر حال مذکورہ خطبہ ذخیرۂ شبلیات میں ایک اہم اضافہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

یہ تفصیل لاہور سے ہمارے کرم فرما جناب پروفیسر احمد سعید صاحب نے بھیجی ہے۔ اس التفات کے لئے ہم ان کے بے حد شکر گذار ہیں۔

حوالے

(۱) زمیندار لاہور ۱۷/ اپریل ۱۹۱۲ء

(۲) زمیندار لاہور، ۱۷/ اپریل ۱۹۱۲ء

[ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ، مئی ۲۰۲۰ء]

ooo

[۹]

بیان شبلی

علامہ شبلی [۱۸۵۷-۱۹۱۴ء] کی سیرت وشخصیت اوران کے عظیم الشان علمی کارناموں کا دائرہ اس قدر وسیع، متنوع اور گوناگوں ہے کہ آٹھ سوصفحات کی ان کی سوانح عمری ''حیات شبلی'' اور ایک درجن سے زاید مستقل کتابوں اورسیکڑوں مضامین ومقالات میں بھی وہ سما نہ سکا۔ اور ایک صدی گذر جانے کے باوجود آئے دن شبلیات کا کوئی نہ کوئی نیا پہلو اور نیا گوشہ سامنے آجاتا ہے۔ راقم نے اپنی متعدد تصنیفات میں باقیات شبلی کو سمیٹنے اور یکجا کرنے کی کوشش کی ہے۔ آثار شبلی، نوادرات شبلی، مکتوبات شبلی، مراسلات شبلی، ''شبلی اور جہان شبلی'' اور ''نقوش شبلی'' راقم کی اسی نوع کی تصنیفات وتالیفات اور مجموعہ مقالات ہیں۔ ادھر علامہ شبلی سے متعلق متعدد نئی معلومات کتب ورسائل میں نظر سے گذریں اوران کی چند نادر اور بیش قیمت تحریریں بھی دستیاب ہوئیں۔ زیر نظر مقالہ میں انہیں کو یکجا کیا گیا ہے۔ یقین ہے یہ سلسلہ ابھی اور دراز ہوگا۔

نوادر کے پارکھ

علامہ شبلی اپنے عہد میں نادر کتابوں پر گہری نگاہ رکھنے والے ایک بڑے مصنف تھے۔ خاص طور پر تاریخ اسلام، اسلامی علوم وفنون اور ادبیات کی اہم اور نادرالوجود کتابیں بھی ان کی نظر میں تھیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک تو وہ کتابوں کے بڑے شائق اور دلدادہ تھے۔ دوسرا یہ کہ تحقیق و تصنیف اور تحقیق ان کا مشغلہ تھا۔ ایک سبب یہ بھی تھا کہ وہ کتب خانوں سے عام تعلق رکھتے تھے۔ وہ جب ۱۹؍سال کی عمر میں حج بیت اللہ کے لئے تشریف لے گئے تو مدینہ منورہ کے کتب خانوں سے استفادہ کیا۔ ۱۸۹۲ء میں جب وہ قسطنطنیہ اور روم ومصروشام کے سفر پر گئے تو وہاں کے متعدد کتب خانوں کو دیکھا اوران کے نوادرات سے استفادہ کیا۔ مصر کا مشہور کتب خانہ خدیو بھی دیکھنے

گئے۔قسطنطنیہ میں کتب خانے دور دور اور دیہاتوں میں واقع تھے۔چنانچہ ان کتب خانوں سے پا پیادہ جا کر ان کی کتابوں اور مخطوطات کا مطالعہ کیا۔نوٹس لئے اور متعدد کتب کاتبوں سے نقل کرائیں۔اسی طرح ہندوستان کے تمام اہم کتب خانے ان کی نظر میں تھے۔ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کے کتب خانہ سے اس قدر بار بار سفر کر کے استفادہ کیا کہ ۱۹۰۶ء میں اس کے فیلو منتخب ہوئے اور آخر تک وہاں جا کر نوادرات کا مطالعہ کرتے اور اس سے اہل علم کو واقف کراتے رہے۔مولانا حبیب الرحمٰن شروانی [۱۸۶۲- ۱۹۵۰ء] اور نواب سید علی حسن خاں [۱۸۶۶- ۱۹۳۶ء] کو بھی ایشیاٹک سوسائٹی کا فیلو انہی نے نامزد کرایا۔کتب خانہ رامپور سے ان کی حد درجہ دلچسپی کے سبب نواب رام پور نے ان سے کتب خانہ کی ترتیب و تنظیم کی فرمائش کی،جس کا خاکہ انہوں نے بنا کر پیش کیا اور اس پر عمل کیا گیا۔اسی طرح خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری اور مولوی خدابخش خاں [۱۸۴۲-۱۹۰۸ء] سے بھی ان کے گہرے روابط تھے۔اس کی اہمیت پر ان کی ایک تحریر بھی ''مقالات شبلی''میں شامل ہے۔اس سے متعلق وی،سی،اسکاٹ اوکونز نے جو کتاب لکھی ہے اور جس کا ترجمہ سید مبارزالدین رفعت نے''ایک مشرقی کتب خانہ''کے عنوان سے کیا ہے۔اس کے آغاز میں سر سید علی امام [۱۸۶۹- ۱۹۳۲ء] کا ایک اقتباس نقل کیا ہے۔اس میں علامہ شبلی کی نوادر پر گہری نگاہ کا ذکر ہے۔وہ اقتباس یہ ہے:

> ''خدابخش مرحوم بڑی دلکش شخصیت کے مالک تھے اور قدیم اسلامی تہذیب کے سانچے میں ڈھلے ہوئے تھے۔انہیں دیکھ کر مجھے وہ تصویریں یاد آجاتی تھیں جو داستان الف لیلہ کی ایک مصور جلد میں میں نے کہیں دیکھی تھیں۔عجیب اتفاق ہے جب میں پہلی بار ان سے ملا ہوں اسی دن ہندوستان کے مشہور عالم مولانا شبلی نعمانی سے بھی میری ملاقات ہوگئی جو اس وقت خدابخش مرحوم کے مہمان کی حیثیت سے ان کے پاس ٹھہرے ہوئے تھے۔ہم سب نے مل کر ایک کھلے میدان میں چائے پی۔یہاں سے لہلہاتی فصلوں کے بڑے بڑے کھیت نظر آتے تھے۔ان کے پرے دریائے گنگا کا پانی لہریں لے رہا تھا۔ان کا نایاب خزانہ بہترین قلمی کتابوں کی صورت میں مولانا شبلی نعمانی کے ملاحظہ کے لئے پھیلا ہوتھا۔اور مولانا ایسی چیزوں

کے ماہر سمجھے جاتے تھے۔ایک کے بعد دوسری نایاب ونادر کتاب اٹھائی گئی اوراس کا
معائنہ ہوتا رہا۔ جب تک یہ شغل جاری رہا میں گویا مبہوت ومسحورانہیں بیٹھا دیکھتا رہا،
نادر چیزوں کے جمع کرنے کا فخر،انہیں کا جوش وخروش اورقدیم چیزوں کی محبت سے
خدابخش مرحوم کا چہرہ دمک رہا تھا۔کچھ ایسی ہی کیفیت مولانا شبلی نعمانی کے چہرہ سے
جھلکتی تھی جو اس وقت مجھے اسلامی تہذیب اور علمی تبحر کا مجسمہ نظر آتے تھے۔''(۱)

قوم پر اثر

مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ [۱۸۹۷-۱۹۷۶ء] نے لکھا ہے کہ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ [۱۸۶۳-۱۹۴۳ء] نے اپنی ایک مجلس میں فرمایا کہ مولانا عبیداللہ سندھیؒ [۱۸۷۲-۱۹۴۴ء] نے جب دہلی میں نظارۃ المعارف قائم فرمایا تو تھانہ بھون آئے تھے۔انہوں نے فرمایا کہ میں علامہ شبلی نعمانی [۱۸۵۷-۱۹۱۴ء] سے ملاتو مسلمانوں کی عام بے راہ روی اور پریشانی اور مبتلائے آفات ہونے کا تذکرہ ہوا۔میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کی نظر میں قوم کی اصلاح کی تدبیر کیا ہے۔؟ علامہ شبلی نے کہا کہ

> ''قوم کی اصلاح صرف وہ لوگ کر سکتے ہیں جن کا قوم پر مکمل اثر ہو اور یہ اثر بغیر تقدس کے نہیں ہوسکتا اور تقدس بغیر تقویٰ اور کثرت عبادت وذکراللہ کے حاصل نہیں ہوسکتا۔''(۲)

مولانا عبیداللہ سندھی اور علامہ شبلی میں مراسم اور مراسلت تھی۔علامہ شبلی ان پر بڑا اعتماد کرتے تھے۔''سیرۃ النبیؐ'' کی تالیف کے زمانہ میں مچانے والوں نے جب واویلا مچایا اور عدم اعتماد کا اظہار کیا تو اعتماد قائم کرنے کے لئے علامہ شبلی نے مسودہ''سیرۃ النبیؐ''انہیں مولانا عبیداللہ سندھی کے توسط سے مولانا محمودحسن صاحب دیوبندیؒ [۱۸۵۱-۱۹۲۰ء] کی خدمت میں بھیجا تھا۔یہ الگ بات ہے کہ انہوں نے مسودہ دیکھنا منظور نہیں کیا۔(۳)

مذکورہ بالا اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دونوں بزرگ ملک وملت کے مسائل پرآپس میں

غور وفکر بھی کرتے تھے۔ البتہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ راوی نے نقل کرنے میں اس اقتباس کا کچھ حصہ غالبًا چھوڑ دیا ہے۔ اس لئے کہ مولانا عبیداللہ سندھی نے علامہ شبلی سے ملت کو ابتلاء سے نکالنے کی تدبیر دریافت کی ہے، جبکہ انہوں نے قوم کی اصلاح کی تدبیر کی بجائے داعی کے صفات اور امتیازات بیان کئے ہیں۔

مجموعہ نظم شبلی اردو

علامہ شبلی کی اخلاقی، سیاسی، تاریخی اور مذہبی نظمیں خاص طور پر ان کی اخیر زندگی میں کہی جانے والی نظمیں بے حد مقبول ہوئیں۔ چنانچہ بقول مولانا سید سلیمان ندوی[۱۸۸۴۔۱۹۵۳ء] ناشرین نے لکھنو، دہلی، بمبئی اور لاہور وغیرہ سے اس کے متعدد ایڈیشن شائع کئے۔ مذکورہ بالا عنوان سے دہلی کے دو ناشرین سید ظہور الحسن موسوی اور منشی سید قربان علی بسمل نے اس مجموعہ کے کئی ایڈیشن چھاپے۔ اسی عنوان سے ۱۹۲۸ء میں ایک ایڈیشن مدینہ اخبار بجنور کے مدیر مولوی مجید حسن [م: نومبر ۱۹۶۶ء] نے اپنے مدینہ پریس بجنور سے بھی شائع کیا تھا، جو ۶۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ سرورق دیدہ زیب اور طباعت بہت صاف ستھری ہے۔ دہلی اور بجنور ایڈیشن میں یہ فرق ہے کہ دہلی والے ایڈیشن میں علامہ شبلی کے کلام کے ساتھ ان کے مختصر حالات اور مولوی عبدالحلیم شرر [۱۸۶۰-۱۹۲۶ء] کا وفیاتی مضمون بھی شامل ہے جبکہ مدینہ پریس بجنور ایڈیشن اس سے خالی ہے۔

الفاروق۔ فارسی ترجمہ

''الفاروق'' علامہ شبلی کی مقبول ترین کتاب ہے۔ ابتک اس کے نو زبانوں میں ترجمے شائع ہو چکے ہیں۔ راقم نے اپنے مقالہ مشمولہ ''متعلقات شبلی'' میں اس کی تفصیل قلم بند کی ہے۔ اس کا ایک فارسی ترجمہ نادر خاں شاہ افغانستان کی بہن علیا جناب نے کیا تھا جو افغانستان سے زمانہ ہوا شائع ہو چکا ہے۔ اس کی تفصیل راقم کے مقالہ میں موجود ہے۔ حال ہی میں اس کا ایک اور فارسی ترجمہ ''زندگی فاروق اعظم عمر بن خطابؓ'' نظر سے گذرا، جو ایران سے شائع ہوا ہے۔ مترجم کا نام

عبداللہ پاسالاری ہے۔۵۳۶ صفحات پر مشتمل اس ترجمہ کا دوسراایڈیشن ۱۳۹۱ش میں شائع ہوا ہے۔اس کی قیمت چارسوریال ہے۔آن لائن بھی دستیاب ہے۔

الفاروق۔سندھی ترجمہ

ہمارے ایک کرم فرما عبدالغنی دایوصاحب نے سندھ سے الفاروق کا سندھی ترجمہ بطور تحفہ بھیجا ہے۔اس کے مترجم انجینئر عبدالمالک میمن ہیں۔اسے فروری ۲۰۱۶ء میں مہران اکیڈمی شکارپور پاکستان نے شائع کیا ہے۔یہ ۳۸۶رصفحات پر مشتمل ہے اور قیمت ۳۵۰روپئے ہے۔آخر میں مہران اکیڈمی شکارپور کی فہرست مطبوعات دی گئی ہیں۔اس سے معلومات ہوتا ہے کہ یہ ایک فعال ادارہ ہے اوراس نے متعدداردو کتابوں کے سندھی ترجمے شائع کئے ہیں۔جس میں مولانا ابوالکلام آزاد،مولانا علی میاں اور طالب الہاشمی کی کتابیں بھی شامل ہیں۔

یہ سندھی ترجمہ الفاروق کا دوسری زبانوں میں دسواں ترجمہ ہے۔

الفاروق۔ہندی تراجم

ادارہ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے الفاروق سیمینار میں راقم نے ''الفاروق کے تراجم'' کے عنوان سے مقالہ پیش کیا تھا۔اس میں یہ تجویز پیش کی تھی کہ اسے ملکی زبان ہندی کا جامہ پہنایا جائے۔مولانا ضیاءالدین اصلاحی مرحوم ناظم دارالمصنّفین وہاں موجود تھے۔انہوں نے اس تجویز پراعتراض جتایا کہ اس سے اصل اردوایڈیشن کی اہمیت کم ہوجائے گی۔مگر پروفیسر محمد یاسین مظہر صدیقی مرحوم[۱۹۴۴-۲۰۲۰ء] نے یہ کہہ کر کہ اب خود مسلمانوں کو ہماری کتابوں کی ہندی میں ضرورت ہے بات ختم کردی تھی۔۱۴رسال بعد ۲۰۱۶ء میں خود دارالمصنّفین نے الفاروق کا ہندی ترجمہ شائع کیا ہے۔اس کے مترجم جناب عبداللہ دانش ہیں۔یہ ۴۵۴رصفحات پر مشتمل ہے۔الفاروق کا ایک اور ہندی ترجمہ اعظم گڑھ کے ایک ممتاز وکیل جناب فیض احمد ایڈوکیٹ نے

کیا ہے۔اس کے ناشر بھی وہ ہی ہیں۔۲۰۷؍صفحات پر مشتمل یہ ترجمہ ۲۰۱۹ء میں شائع ہوا ہے۔

ابتک ''الفاروق'' کے گیارہ زبانوں میں ترجمے شائع ہو چکے ہیں۔سندھی ترجمہ کا ذکر گذشتہ صفحات میں آ چکا ہے۔بقیہ تراجم کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو'' متعلقات شبلی'' شائع کردہ ادبی دائرہ اعظم گڑھ، ۲۰۰۸ء

سیرۃ النبیؐ

ایک بزرگ ماہر تعلیم اور بلند پایہ شاعر ممتاز حسین بسمل سے جناب عبدالرحیم بہاول پوری نے انٹرویو کیا تھا، جو آغا شورش کاشمیری[۱۹۱۷-۱۹۷۵ء] کے ''چٹان'' میں شائع ہوا ہے۔ایک سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ علامہ شبلی کی ''سیرۃ النبیؐ'' سے بہتر کتاب میں نے آج تک نہیں پڑھی۔(۴)

سیرۃ النبیؐ۔سندھی ترجمہ

سیرۃ النبی شبلی کے دو سندھی ترجموں کی اطلاع ملی ہے۔پہلا ترجمہ مولوی فضل احمد غزنوی نے کیا ہے، جبکہ دوسرا ترجمہ سید صالح محمد شاہ نے کیا ہے۔دونوں کی مزید تفصیلات نہ مل سکیں۔پہلا ترجمہ نظر سے گذرا تھا مگر زبان کی ناوقفیت کے سبب تفصیل نوٹ نہ کر سکا۔دوسرے ترجمہ پر ایک تبصرہ نظر سے گذرا۔اس میں بھی کتاب اور مترجم کے نام کے سوا کوئی تفصیل قلم بند نہیں کی گئی ہے۔

سوانح مولانا روم

''سوانح مولانا روم'' علامہ شبلی نعمانی کی چند اہم کتابوں میں سے ایک ہے۔اسی اہمیت کے پیش نظر ایران کے ایک عالم اور مشہور شبلی شناس سید محمد تقی فخر داعی گیلانی[۱۸۸۱-۱۹۶۴ء] نے

اس کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا جو۱۳۳۲ھ ش میں تہران ایران سے شائع ہوا۔اس کی تفصیل راقم نے ''کتابیات شبلی''میں درج کی ہے۔حال ہی میں اس کا ایک پشتو ترجمہ دستیاب ہوا ہے۔اس کا پشتو نام ''مولانا وافکاراو'' ہے۔مترجم کا نام حافظ رابعہ تورستانی ہے۔حافظ رابعہ تورستانی نے تقدیم میں ''سوانح مولانا روم'' کی اہمیت اور پشتو ترجمہ کے اسباب بیان کئے ہیں۔فاضل مترجمہ نے علامہ شبلی کے مختصر حالات زندگی اور کارناموں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔اہمیت کے پیش نظر مترجمہ نے سید محمد تقی فخر داعی گیلانی کا فارسی مقدمہ بھی شامل کتاب کیا ہے۔یہ ترجمہ ۲۳۵ر صفحات پر مشتمل ہے۔شروع کے ۳۲ر صفحات ابجد شماری کے تحت ہیں، جبکہ متن کتاب کے ۲۰۳ر صفحات ہیں۔ اسے مرکز نشرات سعید۔دیلی منور شاہ قصہ خوانی بازار پشاور پاکستان نے شائع کیا ہے۔یہ مطبوعہ نسخہ خانہ فرہنگ جمہوری اسلامی ایران لاہور کے کتب خانہ ''امام علی'' میں محفوظ ہے۔

اس سے پہلے علامہ شبلی کی دو اور مشہور کتابوں '' الفاروق'' اور'' سیرۃ النبیؐ'' کے پشتو ترجمے شائع ہوئے تھے۔''سیرۃ النبیؐ'' کے پشتو زبان میں تین ترجمے ہوئے ہیں۔ان کی تفصیل راقم نے ''کتابیات شبلی'' میں درج ہے۔

سیرت الصدیق

علامہ شبلی کے نام سے یہ کتابچہ فاروقی کتب خانہ ملتان پاکستان نے شائع کیا ہے۔اس میں خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ولادت سے وفات تک کے مختصر حالات ہیں۔یہ علامہ شبلی کی مستقل تحریر نہیں ہے، بلکہ کسی کتاب کا اقتباس کتابچہ کی صورت میں شائع کیا گیا ہے۔

سیرت علیؓ

علامہ شبلی سے منسوب اس کتابچہ کو بھی فاروقی کتب خانہ ملتان، پاکستان نے شائع کیا ہے۔اس میں بھی جیسا کہ نام سے ظاہر ہے امیر المومنین حضرت علیؓ کرم اللہ وجہہ کے مختصر حالات از

ولادت تاوفات درج ہیں۔سنہ اشاعت درج نہیں ہے۔کوئی دیباچہ یا پیش لفظ بھی نہیں لکھا گیا ہے کہ اس سے کسی قسم کی معلومات مل جاتیں۔

غزوہ بدر

علامہ شبلی نے ''سیرۃ النبیؐ'' میں غزوہ بدر پر قدرے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔اہل علم بخوبی واقف ہیں کہ غزوہ بدر کے اسباب کے بارے میں علامہ شبلی کی رائے عام مورخین اور سیرت نگاروں سے مختلف ہے۔چنانچہ ان کے موقف پر متعدد تنقیدیں بھی لکھی اور شائع کی گئیں۔لیکن یہ کتابچہ اس کے جواب میں نہیں بلکہ ''سیرۃ النبیؐ'' کے غزوہ بدر کے مباحث پر مشتمل ہے۔اسے اسلامی پبلشنگ کمپنی اندرون لوہاری دروازہ لاہور پاکستان نے کتابی صورت میں شائع کیا ہے۔ سنہ اشاعت اس پر بھی درج نہیں ہے۔زمانہ کہاں سے کہاں گیا، مگر ہم تک بغیر سنہ اشاعت کے کتب ورسائل چھاپ دیتے ہیں۔

شبلی کی حیات معاشقہ ممنوع

ڈاکٹر وحید قریشی[۱۹۲۵-۲۰۰۹ء] کی بدنام زمانہ کتاب ''شبلی کی حیات معاشقہ'' نے علامہ شبلی کی شخصیت کو خاصا مجروح کیا تھا۔انہوں نے نفسیاتی تنقید کے زیر اثر یہ قصہ گھڑا تھا، مگر جب اس سے علامہ شبلی کی شخصیت کے ساتھ خود مصنف کی ذات بھی مجروح ہوئی تو انہوں نے اس کتاب کو اولاً کتب خانوں سے غائب کرایا اور پھر اس کی اشاعت ہی کو ممنوع قرار دیدیا۔ڈاکٹر انور سدید مرحوم[۱۹۲۸-۲۰۱۶ء] کے ڈاکٹر وحید قریشی سے گہرے مراسم تھے۔انہوں نے ڈاکٹر وحید قریشی کی وفات پر'' کچھ وقت ڈاکٹر وحید قریشی کے ساتھ'' کے عنوان سے ماہنامہ الحمراء لاہور دسمبر ۲۰۰۳ء میں ایک مضمون لکھا ہے۔جس میں اپنی ساٹھ سالہ رفاقت اور یادوں کو قلم بند کیا ہے۔ اس میں انہوں نے انکشاف کیا ہے کہ ڈاکٹر وحید قریشی نے اپنی کتاب کو ممنوع اشاعت قرار دیدیا تھا اور جب اس کا دوسرا ایڈیشن عرفان احمد نے شائع کیا تو وہ خوش نہیں ہوئے بلکہ اسے بے محل اور

ناواجب قرار دیا۔(۵)

ڈاکٹر وحید قریشی کی کتاب کی طرح یہ بات بھی سمجھ میں نہیں آئی کہ جب انہوں نے ممنوع اشاعت قرار دیدیا تھا تو وہ شائع کیسے ہوگئی۔؟

علامہ شبلی اور مرزا دبیر

علامہ شبلی نے ''موازنہ انیس و دبیر'' لکھ کر جہاں اردو ادب میں گراں قدر اضافہ کیا، وہیں انیس و دبیر کو زندہ جاوید بھی کر دیا۔ دبیریوں نے یہ کہہ کر کہ اس میں دبیر کی حق تلفی کی گئی ہے، اس کے خلاف ایک طوفان برپا کیا۔ چنانچہ اس کے جواب میں ردالموزنہ، تردید الموازنہ اور المیز ان جیسی کتابیں لکھی گئیں۔ اور اس قدر شور مچایا گیا کہ مرزا دبیر کی حق تلفی ایک استعارہ بن گئی۔ یہاں تک کہ بنارس کے ایک شاعر مرزا محمد حسن فائز بنارسی[۱۸۵۶-۱۹۲۹ء] نے یہ قطعہ کہہ ڈالا:

کس درجہ ہوں ناچیز اور حقیر اے فائز
بات اپنی نہیں ہے دل پذیر اے فائز
گویا زمانہ مولوی شبلی ہے
میں ہوں ہمہ تن نظم دبیر اے فائز (۶)

ایک غلط بیانی کی تردید

''مولانا شبلی کی تاریخی نظم کی بازیافت'' کے عنوان سے حفیظ الرحمٰن خاں نے ایک مضمون لکھا ہے، جو ماہنامہ الحمراء لاہور ستمبر ۲۰۰۴ء میں شائع ہوا ہے۔ اسے ہمارے دوست اور بزرگوں کے علم وفن کے شیدائی جناب شبیر احمد میواتی صاحب نے ہمارے ملاحظہ کے لئے لاہور سے بھیجا ہے۔ مضمون نگار علامہ شبلی کے عقیدت مند ہیں۔ انہوں نے علامہ شبلی کے بارے میں لکھا ہے کہ

''شبلی نعمانی فارسی اور اردو کے باکمال شاعر بھی ہیں۔ وہ اردو میں قومی شاعری کے بانی ہیں۔ مولانا حالی نے سرسید کے اصلاحی نقطہ نظر کی روشنی میں قوم کو جگانے والی

شاعری کی۔ان کا دل ماضی سے ضیاء پاتا ہے۔ان کی نگاہ جدید افکار سے خیرہ تھی، لیکن شبلی اپنی نظم ونثر کے ذریعے دوش کے آئینے میں فردا کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کا حوصلہ عطا کرتے ہیں۔جن بنیادوں پر علامہ اقبال اور مولانا ظفر علی خاں نے قومی شاعری کا قصر تعمیر کیا اس کی خشت اول مولانا شبلی نے رکھی۔اقبال کی شاعری حکمت وبصیرت کے وسیع تر افق کی پہنائیوں کی خبر لاتی ہے۔ظفر علی خاں کی شاعری ہنگامہ امروز سے جلا پاتی ہے۔شاعری میں ہنگامی موضوعات کو بے ساختہ زبان شعر میں ادا کرنے کا آغاز بھی مولانا شبلی نے کیا جو ظفر علی خاں کا طرہ امتیاز ہے۔''(۷)

مضمون نگار کے استاذ اور استاذ الاساتذہ نور محمد خاں صدر مدرس گورنمنٹ کمپری ہائی اسکول ملتان بھی علامہ شبلی کے عقیدت کیش تھے۔علامہ شبلی کی ایک نظم جس کا مصرعہ اولی

اک جرمنی نے مجھ سے کہا از رہے غرور

ہے،انہیں زبانی یاد تھی اور اسے وہ اکثر سنایا کرتے تھے۔ مذکورہ بالا مضمون میں مضمون نگار نے اپنے استاذ نور محمد خاں کے حوالہ سے اس نظم کو نقل کیا ہے اور اسے ایک بازیافت قرار دیا ہے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ علامہ شبلی کی یہ نظم ان کی وفات کے بعد پہلے زمیندار لاہور میں مولانا ظفر علی خاں نے شائع کی۔ پھر ۱۹۱۶ء میں ان کے کلیات میں شائع ہوئی،جس کے بیسیوں ایڈیشن ہندو پاک سے شائع ہو چکے ہیں۔مضمون نگار اگر ایک بار بھی ''کلیات شبلی'' دیکھنے کی زحمت گوارا کر لیتے تو اسے بازیافت نہ قرار دیتے۔اور اس کے متن میں جو متعدد اغلاط راہ پا گئے ہیں ان سے بھی یہ نظم پاک ہو جاتی۔مضمون نگار نے اپنے استاذ کے حوالہ سے یہ بھی لکھا ہے کہ

''انہوں نے بیان کیا کہ ۱۹۱۳ء کے اواخر میں اور ۱۹۱۴ء کے آغاز میں انگلستان اور جرمنی کے تعلقات میں شدید بگاڑ پیدا ہو گیا۔یورپ عملاً دو حصوں میں تقسیم ہو گیا اور طبل جنگ بجنے کو تھا۔یہ صورت حال ستمبر ۱۹۱۴ میں جنگ عظیم اول کے آغاز پر منتج ہوئی۔ ہندوستان کے اہل درد جن میں علامہ شبلی پیش پیش تھے،اس وقت کے حالات سے پوری طرح باخبر تھے۔ چنانچہ انہوں نے انہی دنوں نئی نظم کی صورت میں تبصرہ کیا، جو بلا عنوان ان کے رسالے غالباً الندوہ میں شائع ہو گئی۔اس پر ہندوستان کے

انگریز حاکموں کے ماتھے پر بل پڑ گئے ۔مولانا کو گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا۔الندوہ کی تمام کاپیاں ضبط کر کے نذر آتش کر دی گئیں۔مولانا کچھ عرصہ انگریز کی جیل میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرتے رہے۔تقریباً تین ماہ بعد ضمانت پر رہا ہوئے۔ اس کے بعد مقدمہ کی کارروائی شروع ہوئی لیکن پیشی کی تاریخ سے چند روز قبل شدید علالت کی حالت میں وفات پائی۔اس واقعہ کا ذکر کہیں نہیں ملتا۔بعض نام نہاد محققین مولانا کی وفات کو بندوق چل جانے کا شاخسانہ بیان کرتے ہیں،لیکن بندوق کی گولی لگنے کا واقعہ پہلے کا ہے،جس کے نتیجے میں ان کا پاؤں کاٹ دیا گیا تھا اور زخم ٹھیک ہو گیا تھا۔اصل یہ ہے کہ انگریزوں نے مولانا کی نظم کو بغاوت پر محمول کیا۔ انہیں جیل میں اذیت دی گئی،جس کے نتیجے میں وہ مقدمے کی پیشی سے چند روز قبل انتقال کر گئے۔(۸)

حفیظ الرحمٰن خاں کا یہ مضمون ماہنامہ الحمراء،لاہور ستمبر۲۰۰۴ء میں شائع ہوا ہے۔بلا شبہ اس سے پہلے علامہ شبلی کی سیرت و شخصیت پر ''حیات شبلی'' کے علاوہ بیسیوں اہم کتابیں،دس سے زاید رسائل و جراید کے خصوصی شمارے اور سیکڑوں مضامین و مقالات شائع ہو چکے تھے۔ان سب میں بلکہ کسی کتاب میں بھی مذکورہ واقعہ درج نہیں ہے۔حقیقت یہ ہے کہ قید و بند،رہائی اور انگریزوں کے اذیت ناک رویہ کا تذکرہ،عدالت،پیشی،سب فرضی باتیں ہیں۔مضمون نگار پر سخت تعجب ہوتا ہے کہ اس نے ایک بار بھی نہ ''حیات شبلی'' کا مطالعہ کیا اور نہ دیگر کتابوں کے دیکھنے کی ضرورت محسوس کی۔بہر حال مذکورہ بالا نظم اس مضمون کی اشاعت سے پون صدی پہلے ''کلیات شبلی''،میں شائع ہو چکی تھی اور علامہ شبلی کے قید و بند کا قصہ اور الندوہ کے جلائے جانے کا واقعہ قطعی طور پر درست نہیں۔

علامہ شبلی اور شیخ محمد

علامہ شبلی کی بلند پایہ تصنیفات اور ان کے فضل و کمال کے عام شہرہ کے سبب اہل علم اور

ارباب کمال ان سے ملاقات میں فخر محسوس کرتے تھے۔ چنانچہ ان سے شرف ملاقات حاصل کرنے کے لئے ملک و بیرون ملک کے اہل علم ان کی خدمت میں حاضر ہوتے رہتے تھے۔ ان کا دائرہ اثر بھی بے حد وسیع تھا۔ مشہور ایرانی مترجم سید محمد فخر داعی گیلانی [۱۸۸۱- ۱۹۶۴ء] جنہوں نے علامہ شبلی کی متعدد کتابوں کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا ہے، وہ بھی علامہ شبلی سے بمبئی میں ایک ملاقات ہی میں ان کے گرویدہ ہوئے تھے۔ حال ہی میں ایک کتاب ''روزنامہ سیاحت'' سے معلوم ہوا کہ ایران کے ایک بڑے اہل علم شیخ محمد رئیس محکمہ تمیز یہ جو عرصہ تک ہندوستان اور حیدرآباد میں مقیم رہے، ان سے بھی علامہ شبلی کے بڑے مراسم تھے اور اکثر دونوں میں ملاقاتیں رہتی تھیں۔ ہمیں اس کا علم ''روزنامچہ سیاحت'' سے ہوا۔(۹) روزنامچہ سیاحت میں اس واقعہ کا ذکر ۵/ اگست ۱۹۱۱ء کے ذیل میں آیا ہے۔ یہ تفصیل ہمیں ایک اسکالر ڈاکٹر لیلیٰ عبدی نے ایران سے بھیجی ہے۔

وجہ التفات

خواجہ غلام السیدین [۱۹۰۴-۱۹۷۱ء] نے خواجہ غلام الثقلین [۱۸۷۲-۱۹۱۵ء] کی شخصیت اور سوانح پر ''مرد درویش'' کے عنوان سے ایک کتابچہ لکھا ہے۔ خواجہ غلام الثقلین نے عہد شبلی میں ایم اے او کالج علی گڑھ میں تعلیم پائی تھی۔ ان کا نام تحریک علی گڑھ کے ممتاز اشخاص میں ہوتا ہے۔ علامہ شبلی ان کی طرف کیوں اور کس طرح متوجہ ہوئے، اس کے بارے میں خواجہ غلام السیدین لکھا ہے کہ

> ''جب وہ علی گڑھ کالج میں داخل ہوئے تو مولانا شبلی کالج کے لائبریرین تھے۔(۱۰) وہ دیکھتے کہ ایک نوجوان طالب علم تقریباً ہر روز آتا ہے، لائبریری سے ایک کتاب لیتا ہے اور اگلے دن اسے واپس کر دیتا ہے۔ انہیں خیال ہوا کہ شاید یہ نوجوان خواہ مخواہ کتابیں لے جاتا ہے، پڑھتا وڑھتا نہیں۔ پوچھا تو اس نے کہا جی نہیں میں تو ہر کتاب پڑھ کر واپس کرتا ہوں۔ مولانا کو بہت تعجب ہوا اور انہوں نے چند کتابوں کے بارے میں سوال کیا تو اندازہ ہوا کہ اس نوجوان کا یہ خلاف قیاس بیان بالکل صحیح ہے۔ اس وقت سے مولانا شبلی ان پر خاص طور پر مہربان ہو گئے تھے

اور یہ خلوص کا رشتہ ان کے انتقال تک قائم رہا۔''(۱۱)

ندوہ سے علامہ شبلی کا استعفیٰ اور بے چینی

اخبار زمیندار لاہور کی ایک رپورٹ:

اخبار زمیندار کے ذریعہ سے جب دارالعلوم ندوۃ العلماء میں یہ خبر مشہور ہوئی کہ شمس العلماء علامہ شبلی نعمانی نے دارالعلوم کے عہدہ سکریٹری سے استعفا دیدیا ہے تو ایک عام بے چینی پھیل گئی اور رنج وقلق کی کوئی حد نہ رہی۔ ہر شخص ان خطرناک نتائج کا انتظار کرنے لگا جو قدرتاً اس واقعہ کے بعد ظاہر ہوں گے۔ ان خطرات کو محسوس کر کے مدرسین وطلبائے دارالعلوم نے مناسب خیال کیا کہ ایک عام اجتماعی آواز کے ذریعہ سے اپنے رنج وغم کا اظہار کریں اور علامہ ممدوح سے درخواست کریں کہ وہ اپنا استعفا واپس لے لیں۔ چنانچہ ۱۳ر جولائی ۱۹۱۳ء کو دارالعلوم کے ہال میں ایک جلسہ زیر صدارت شمس العلماء مولانا مفتی محمد عبداللہ صاحب ٹونکی پرنسپل دارالعلوم مدرسین و طلبہ کا منعقد ہوا، جس میں نہایت جوش وخروش سے مولانا شبلی کے ایثار نفس اور ان کی بیش بہا خدمات کا اعتراف کیا گیا اور مندرجہ ذیل رزولیشن پرآب آنکھوں اور مضطرب دلوں کے ساتھ بالاتفاق پاس ہوئے۔

۱۔ ہم مدرسین وطلبائے دارالعلوم مجلس انتظامیہ کی خدمت میں بہ ادب ملتمس ہیں کہ شمس العلماء مولانا شبلی صاحب نعمانی کی گذشتہ خدمات اور آئندہ توقعات پر نظر کر کے ان کا استعفاء واپس فرمادیا جاوے۔

محرک: شمس العلماء مولانا مفتی محمد عبداللہ صاحب پرنسپل دارالعلوم

موید: مولوی مسعود علی صاحب، مولوی خلیل احمد صاحب عرب، مولوی معین الدین احمد

۲۔ ہم مدرسین وطلبائے دارالعلوم جناب شمس العلماء مولانا شبلی صاحب نعمانی کے استعفا پر دلی رنج اور تاسف کا اظہار کرتے ہیں اور مولانا موصوف کی خدمت میں بادب ملتمس ہیں کہ ہم لوگوں کی حالت پر رحم فرما کر اپنا استعفاء واپس فرمالیں۔

محرک: حاجی معین الدین صاحب بہاری۔
موید: مولوی محمد حسن صاحب، مولوی محمد اکرام اللہ خاں صاحب
۳۔ مذکورہ بالا رزولیشن کی نقل انگریزی اور اردو اخبارات میں روانہ کی جائے۔
محرک: جناب مولانا سید علی صاحب ادیب دارالعلوم
موید: مولوی عبدالسلام صاحب (ندوی)، مولوی عبدالرحمٰن صاحب نگرامی، مولوی عبدالجلیل صاحب پشاوری۔

جلسہ مذکورہ میں اس خبر کا بھی ذکر ہوا جو مولانا سید محمد عبدالحی صاحب نائب ناظم اور منشی محمد احتشام علی صاحب معتمد مال کے استعفے کے متعلق مشہور ہوئی ہے، جس پر اظہار افسوس کیا گیا اور مجلس انتظامیہ سے یہ درخواست کرنے کی سفارش کی گئی کہ ان ہر دو حضرات کے استعفے بھی نامنظور فرمائے جاویں۔ (راقم معین الدین صاحب بہاری متعلم درجہ تکمیل دینیات)
مندرجہ بالا واقعہ صحیح ہے۔ مفتی محمد عبداللہ ٹونکی پرنسپل دارالعلوم۔ (۱۲)

ندوہ میری تمام زندگی کا مرکز

علامہ شبلی کی یہ نادر تحریر ابھی حال ہی میں ہمارے کرم فرما اور مشہور مصنف جناب پروفیسر احمد سعید صاحب لاہور کو دستیاب ہوئی تھی۔ انہوں نے از راہ علم دوستی ہمارے پاس بھیجی ہے۔ پروفیسر احمد سعید صاحب کی برصغیر کی تاریخ پر بڑی گہری نظر ہے۔ انہوں نے اس موضوع پر کئی اہم اور قابل ذکر کتابیں ''روزنامہ پیسہ اخبار اور تحریک آزادی''، ''مولانا اشرف علی تھانوی اور تحریک آزادی''، ''قائد اور مسلم پریس''، ''اقبال اور قائد اعظم''، ''حیات قائد اعظم'' اور ''بزم اشرف کے چراغ'' وغیرہ لکھی ہیں اور آج بھی وہ سرگرم عمل ہیں۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالی صحت و تندرستی کی دولت سے مسلسل نوازے۔

علامہ شبلی کی یہ نادر تحریر ان کے شکریہ کے ساتھ یہاں درج کی جاتی ہے۔ یہ دراصل ایک مراسلہ ہے جو علامہ شبلی نے مولانا ظفر علی خاں ایڈیٹر زمیندار لاہور کو لکھا تھا، جس میں انہوں نے

ندوہ سے اپنے استعفے پر اظہار خیال کیا ہے۔

''میں نے ندوہ کی معتمدی سے جو استعفا دیا ہے اس سے عام لوگوں کو یہ خیال پیدا ہو گیا ہے کہ میں ندوہ سے بے تعلق ہو گیا ہوں۔

استعفاء کے بعد سے چونکہ میں نے بالکل سکوت و خاموشی اختیار کی حالانکہ اس بات کی ضرورت تھی کہ اپنے استعفاء کے بعد ندوہ کی موجودہ اور آئندہ حالت پر ایک مفصل تحریر شائع کرتا، جس سے وہ خیال قوت پکڑتا گیا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ندوہ میری تمام زندگی کا مرکز ہے۔ میں اس سے کسی طرح کبھی الگ نہیں ہو سکتا۔ البتہ ان دنوں بہ وجہ مصروفیت تالیف سیرت نبویؐ اور ضعف و علالت ندوہ کے علمی کاموں میں حصہ نہ لے سکا، لیکن عنقریب ایک مستقل تحریر شائع کر سکوں گا، جس سے صحیح حالات کا انکشاف ہو۔ میرے طریق عمل میں تفصیل سے بتا سکوں گا کہ ندوہ تمام قوم کا مشترکہ کام سمجھا جا سکتا ہے۔ ندوہ کا سب سے بڑا نقص یہی ہے کہ ابھی تک اس میں قوم کی پوری طاقت شریک نہیں ہے۔ دیوبند کے علماء ابتداء سے اس سے الگ رہے۔ انگریزی تعلیم یافتہ گروہ میں بہت سے لوگ اس کو قومی تعلیم گاہ علی گڑھ کا حریف سمجھتے رہے۔ موجودہ حالات نے ہر مسلمان میں یہ احساس پیدا کر دیا ہے کہ قوم کا جو کام ہو اب مجموعی قوت کے ساتھ ہونا چاہئے۔ (۱۳)

شبلی

علامہ شبلی کا پیام طلبائے ندوہ کے نام

زمیندار لاہور کی ایک رپورٹ:

افسوس ہماری آہ بے اثر اور نالہ نارسا ثابت ہوا، یعنی شمس العلماء علامہ شبلی نعمانی نے باوجود ہماری التجا کے اپنا استعفاء واپس نہ فرمایا اور ارکان انتظامیہ نے بھی بکثرت آراء مولانا کا استعفاء منظور کر لیا۔ اس اندوہناک واقعہ سے بے چین اور گوناگوں جذبات سے متاثر ہو کر طلبائے

دارالعلوم وجمیع مدرسین نے ۲۷رجولائی ۱۹۱۳ء کو بصدارت شمس العلماء مولانا مفتی محمد عبداللہ صاحب پرنسپل دارالعلوم آخری مرتبہ اپنا قلق واضطراب کا اظہار کرنے کے لئے ایک عام جلسہ کیا اور مولانا کی خدمت میں اظہار تاسف کا تار بھیجنے کی تحریک منظور کی۔اس کے بعد مولانا موصوف کا وہ پیام سنایا گیا جوانہوں نے ساحل سمندر (بمبئی) سے متعلمین دارالعلوم کے نام بھیجا ہے اور جس کا ایک ایک لفظ مولانا کے دلی جذبات کا ترجمان ہے۔واقعہ کی اہمیت اور اس پیام کی تاثیر ایسی زبردست تھی جس نے سامعین کے دلوں کو ہلا دیا۔اس موقعہ پر طلباء نے اپنے پرجوش اور ولولہ انگیز تقریروں سے جلسہ کو مجلس ماتم بنا دیا۔اوراس ناقابل تلافی نقصان پر نہایت خلوص وصداقت کے ساتھ اظہار تاسف کیا۔جلسہ کا آخری منظر نہایت پراثر تھا،جبکہ تمام حاضرین جلسہ نے نہایت ادب کے ساتھ کھڑے ہوکر مولانا کی صحت ودرازی عمر کے لئے دعا مانگی اور آمین کی موثر آوازوں کے درمیان اس غم انگیز جلسہ کا خاتمہ ہوا۔

مولانا کا وہ پیام جوطلبائے دارالعلوم اور مدرسین کے نام آیا ہے،حسب ذیل ہے:

''مولانا اور جملہ مدرسین وطلبہ۔تسلیم!

آپ صاحبوں کی ہمدردی اور قدردانی کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔لیکن فرمایئے چارہ کیا ہے؟۔پورے چار برس گذرے۔بجز اس کے ہر کام میں میری مخالفت کی گئی اور کیا ہوا۔اس بنا پر ندوہ کو کیا فائدہ پہنچا سکتا ہوں؟۔اور ایک برس بھی آزادی سے کوشش کرتا تو ندوہ کو کچھ ترقی دے سکتا۔اس لئے یہی بہتر ہے کہ اور لوگ یکسوئی سے کام کریں۔ممکن ہے کہ وہ مجھ سے اچھا کرسکیں۔ہر حال میں میں مدرسہ کا اور طلبہ کا ویسا ہی خدمت گذار رہوں گا۔اب حمیت اور ہمدردی کا تعلق بے لاگ ہوگا،یعنی افسری کی ظاہری بیگانگی نہ رہے گی اور بچے دیکھیں گے کہ میں کیونکر ان کا برابر کا بھائی بن کر کام کرتا ہوں۔

افسوس ہے کہ میری طبیعت اب تک صاف نہیں ہوئی اور لکھنو آؤ تو فوراً بیمار پڑ جاؤں، ورنہ اسی وقت آجاتا۔سب کو میرا نیازمندانہ سلام کہئے۔

میرا خط لڑکوں کو بھی دکھلا دیجئے،جہاں تک ان سے تعلق ہے۔

شبلی

بمبئی ۱۶؍جولائی ۱۹۱۳ء(۱۴)

سیدزادے کودعائیں

تذکرہ قصیدہ نگاران امروہہ کے مصنف ڈاکٹرعظیم امروہوی نے لکھا ہے کہ ایک سید زادے سیدسالم حسین نقوی متخلص بہ عرشی [۱۸۷۵-۱۹۶۰ء] نے نوجوانی میں'' الفاروق'' کا مطالعہ کیااورعلامہ شبلی سے ملاقات کے لئے چلے گئےاور بقول ڈاکٹرعظیم امروہوی:

''وہاں ایک گوشے میں نشست اختیار کی۔اس موقع پر دیگرلوگ بھی موجود تھے۔ جب وہ چلے گئےتوشبلی آپ سےمخاطب ہوئےاورفرمایا کہ''صاحب زادے کہئے کیا کہنا ہے۔'' آپ نے الفاروق پراپنی رائے کا اظہار کیا۔شبلی کی تحقیق وتلاش کی داددی اور کہنے لگے کہ''بعدرسولؐ دروازہ حضرت علیؓ کونذرآتش کرنے کاواقعہ جوآپ نے بیان کیا ہے،اس میں آپ نے یہ کمال کردیا کہ ایک حقیقت کوقیاس سے بدل دیا ہے''۔شبلی یہ جملہ سن کرعرشی کی ذہانت سے بہت متاثر ہوئے اوروطن وغیرہ معلوم کیا اورسیدزادے کہہ کردعائیں دیں۔''(۱۵)

ایسامحسوس ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے واقعہ نقل کرنے میں کچھ باتیں چھوڑ دی ہیں،اور پھر یہ بھی کہ علامہ شبلی سیدزادے سے کیا کہتے۔

شبلی مغفورکی نداا قصائے غیب سے

یہ مولاناظفرعلی خاں [۱۸۷۳-۱۹۵۶ء] کی ایک نظم کاعنوان ہے جوانہوں نے علامہ شبلی کی ایک نظم کی زمین میں کہی ہے۔مولاناظفرعلی خاں علامہ شبلی کے خاص شاگردوں میں سے تھے۔ اورانہیں علامہ شبلی کی شاگردی پر ہمیشہ نازرہا۔یوں توانہوں نے علامہ شبلی کاقصیدہ بھی لکھا ہے، لیکن ان کا یہ اعترافیہ شعرخاص طورپرقابل ذکرہے:

یہ فیض صحبت علامہ شبلی کا صدقہ ہے
کہ دنیائے ادب میں دھوم ہے میرے مقالوں کی

مولانا ظفر علی خاں کی یہ نظم ہفت روزہ زمیندار لاہور ۱۶/جون ۱۹۲۹ء کے شمارے میں سرورق پر شائع ہوئی ہے اور آج بھی پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے:

امان اللہ خاں بددل نہ ہووہ دن بھی آتا ہے
کہ پھر چل کر تری دولت ترے گھر سر کے بل آئے

ترا صبر آسماں سے کھینچ لائے حق کی رحمت کو
اور اس رحمت کا چشمہ تیرے قدموں میں ابل آئے

پھریرا تیرا پھر لہرائے قندھار اور غزنی پر
ترے قبضہ میں کابل آئے اور ساتھ اس کے ٹل آئے

بکھیرے اپنے جلوے پھر ترا اقبال مشرق میں
یہ سورج حسب عادت پردۂ شب سے نکل آئے

مقدر کو گوارا ہو نہیں سکتا ترا جانا
نظام ایشیا میں جس کے جاتے ہی خلل آئے

بھنور میں ناؤ تیری گھر گئی ہے یک بیک لیکن
''عجب کیا ہے یہ بیڑا غرق ہوکر پھر اچھل آئے''

کہ ہم نے انقلاب چرخ گرداں یوں بھی دیکھے ہیں

شعرالعجم کا عربی ترجمہ

پانچ جلدوں میں شعرالعجم نہ صرف علامہ شبلی کی بلکہ اردو زبان کی مقبول ترین کتاب ہے۔ فارسی زبان میں اس کے دو ترجمے شائع ہو چکے ہیں۔ سید محمد تقی فخر داعی گیلانی [۱۸۸۱-۱۹۶۴ء] نے ایران میں اور سرور خاں گویا افغانستان کے ملک الشعراء نے اس کو فارسی کا جامہ پہنایا۔ اب عربی اہل قلم اور علامہ شبلی کی کئی کتابوں کے مترجم جناب دکتور جلال سعید الحفناوی نے شعرالعجم کی ابتدائی تین جلدوں کا عربی میں ترجمہ کیا ہے۔ جسے المرکز القومی للترجمہ مصر نے شائع کیا ہے۔ سنہ اشاعت درج نہیں ہے۔

نقد شعرالعجم کا فارسی ترجمہ

انجمن ترقی اردو کے سہ ماہی رسالہ ''اردو'' میں علامہ شبلی کی کتاب شعرالعجم پر حافظ محمود شیرانی [۱۸۸۰-۱۹۴۶ء] نے تنقید لکھی، جسے بابائے اردو مولوی عبدالحق [۱۸۷۰-۱۹۶۱ء] نے اولاً انجمن ترقی اردو کے مجلّہ ''اردو'' میں بالاقساط شائع کیا۔ بعدازاں ۱۹۴۲ء میں انجمن ہی کی طرف سے کتابی صورت میں شائع کیا۔ ایران میں اس کا فارسی ترجمہ شائع ہوا ہے۔ اس کے مترجم ڈاکٹر شاہد چودھری اور ڈاکٹر توفیق سبحانی ہیں۔ دانش گاہ پیام نور ایران نے ۱۳۸۰ش میں اسے شائع کیا ہے۔

شعرالعجم کا سیریلیک ایڈیشن

سیریلیک ایک رسم الخط ہے جو تاجکستان اور اس کے قرب و جوار میں استعمال ہوتا ہے۔ شعرالعجم کے فارسی ترجمہ از سید محمد تقی فخر داعی گیلانی کا ایک ایڈیشن سیریلیک رسم الخط میں تاجکستان سے شائع ہوا ہے۔ سیریلیک رسم الخط میں کس نے منتقل کیا اس کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ سیریلیک ایڈیشن دو حصوں میں طبع ہوا ہے۔ پہلا حصہ ۵۴۴ صفحے اور دوسرا حصہ ۵۷۶ صفحے پر مشتمل ہے۔

مطبعہ دانش گاہ دولتی آموزگاری صدرالدین عینی تاجکستان سے شائع ہوا ہے۔ اسے مرکز تحقیقات استرتز یک، تاجکستان سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔

سیرت طیبہ

علامہ شبلی نعمانی نے علی گڑھ کے زمانہ قیام میں ایم اے او کالج کے طلبہ کے لئے سیرت پر عربی میں ایک رسالہ ''بدء الاسلام'' مرتب کیا تھا۔ جو عرصہ تک کالج کے نصاب میں شامل رہا اور پڑھا پڑھایا جاتا رہا۔ علامہ حمید الدین فراہی [۱۸۶۴-۱۹۳۰ء] نے اس کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا تھا۔ نواب حمید اللہ خاں [۱۸۹۴-۱۹۶۰ء] بھوپال کی بیگم میمونہ سلطان شاہ بانو نے جو کئی کتابوں کی مصنفہ ومولفہ تھیں۔ بیگم سلطان جہاں [۱۸۵۸-۱۹۳۰ء] کی خواہش پر فارسی ترجمہ کا اردو میں ترجمہ جو'' آغاز اسلام'' کے نام سے شائع ہوا۔ ان تینوں کا مجموعہ ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی کی تحقیق وتدوین کے ساتھ دارالمصنّفین اعظم گڑھ نے شبلی صدی مطبوعات کے تحت ۲۰۱۶ء میں شائع کیا ہے۔ محقق نے بلاشبہ بڑی محنت اور دقت نظری سے کام لیا ہے۔ اس وجہ سے ابتک کی تمام اشاعتوں میں یہ سب سے معتبر اور صحیح اشاعت ہے۔

'' آغاز اسلام'' کا ایک ایڈیشن یونیورسل بکس لاہور نے ۱۹۸۲ء میں ''سیرت طیبہ'' کے نام سے شائع کیا ہے۔ یہ ایڈیشن محمد احسان الحق نے مرتب کیا ہے۔ فاضل مرتب نے بڑے مفید اور معلوماتی حواشی لکھے ہیں۔ جس کی تفصیل خود ان ہی کے قلم سے ملاحظہ ہو۔

> ''موجودہ اشاعت میں میمونہ سلطان کے اردو ترجمہ کو متن کی ضروری تصحیح اور ضروری حواشی کے ساتھ پیش کیا جارہا ہے۔ متن میں آنے والی آیات کے نمبر اور متعلقہ صورتوں کے نام درج کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے ترجموں میں جہاں کہیں الجھاؤ کا احساس ہوا ہے وہاں شاہ بانو کے ترجمہ آیت کی جگہ نامور علماء ومفسرین میں سے کسی ایک کا ترجمہ شامل کردیا گیا ہے۔ حواشی میں اس قسم کے اضافوں کے ساتھ ساتھ اصحاب واشخاص ومقامات کتاب کے بارے میں ضروری تصریحات وتوضیحات بھی

شامل کر دی گئی ہیں۔ امید ہے کہ تہذیب وتحشیہ کے اس کام سے کتاب زیادہ مفید اور معلومات افزاء ہو جائے گی۔‘‘(۱۲)

’’سیرت طیبہ‘‘ پر نامور اہل قلم اور مجلس ترقی ادب لاہور کے ڈائرکٹر ڈاکٹر تحسین فراقی صاحب نے تفصیلی مقدمہ لکھا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ بہت عمدہ، جامع اور معلومات افزاء مقدمہ سپرد قلم کیا ہے۔

سیرۃ النبیؐ میں ذکر اہل بیت

علامہ شبلی کی شخصیت اور گراں قدر خدمات کے جائزے پر مشتمل کئی تحقیقی مقالے ہند و پاک کی یونیورسٹیوں میں لکھے گئے ہیں۔ جس کی تفصیل ’’کتابیات شبلی‘‘ میں پیش کی جا چکی ہے۔ حال ہی میں ایران میں لکھے جانے والے ایک مقالے کی تفصیل دستیاب ہوئی ہے۔ اس مقالے کا عنوان ’’سیرۃ النبیؐ میں نبی کریمؐ اور اہل بیت کے بارے شبلی نعمانی کے نقطہ نظر کا تجزیہ‘‘ ہے۔ یہ مقالہ حسن رضا حیدری نے ڈاکٹر رجب نزاد کی رہنمائی میں لکھا ہے اور پی ایچ ڈی کے لئے جامعہ المصطفیٰ میں ۸۹-۱۳۸۸ش میں جمع کیا ہے۔ یہ تھیس تہران کے کتب خانے میں محفوظ ہے، لیکن یہ تفصیل معلوم نہیں ہو سکی کہ آیا اس پر انہیں سند تفویض ہوئی یا نہیں۔

علامہ شبلی کی ایک نظم کا انگریزی ترجمہ

ایڈیٹر زمیندار لاہور مولانا ظفر علی خاں [۱۸۷۳-۱۹۵۶ء] علامہ شبلی نعمانی کے ممتاز تلامذہ میں سے تھے۔ انہیں انگریزی اور انگریزی ادبیات پر بڑا عبور حاصل تھا۔ ترجمہ کی بھی ان میں بڑی صلاحیت تھی۔ چنانچہ انہوں نے متعدد کتابوں کا اردو زبان میں ترجمہ کیا۔ ’’معرکہ مذہب وسائنس‘‘ ان کا ایک معرکہ آرا ترجمہ ہے۔ انہوں نے اپنے استاذ کی شہرہ آفاق کتاب ’’الفاروق‘‘ کا بھی انگریزی میں ترجمہ کیا ہے، جس کے ایک سے زاید ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ یہی نہیں

انہوں نے اپنے استاذ کی ایک مشہور نظم جو انہوں نے سانحہ مسجد کانپور پر لکھی تھی اس کا بھی انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ اس نظم کا عنوان ہے:

ہم کشتگان معرکہ کان پور ہیں

چونکہ یہ علامہ شبلی کی اردو شاعری کا انگریزی میں پہلا اور غالباً اکلوتا نمونہ ہے۔ اس لئے اسے یہاں نقل کیا جاتا ہے۔ پہلے اصل نظم نقل کی گئی ہے۔ بعدازاں انگریزی ترجمہ:

کل مجھ کو چند لاشہ بے جاں نظر پڑے
دیکھا قریب جاکے تو زخموں سے چور ہیں
کچھ طفل خورد سال ہیں جو چپ ہیں خود مگر
بچپن یہ کہہ رہا ہے کہ ہم بے قصور ہیں
آئے تھے اس لئے کہ بنائیں خدا کا گھر
نیند آگئی ہے منتظر نفخ صور ہیں
کچھ نوجواں ہیں بے خبر نشہ شباب
ظاہر میں گرچہ صاحب عقل وشعور ہیں
اٹھتا ہوا شباب یہ کہتا ہے بے دریغ
مجرم کوئی نہیں ہے مگر ہم ضرور ہیں
سینہ پہ ہم نے روک لئے برچھیوں کے وار
از بسکہ مست بادہ ناز وغرور ہیں
ہم آپ اپنا کاٹ کے رکھ دیتے جوسر
لذت شناس ذوق دل ناصبور ہیں
کچھ پیر کہنہ سال ہیں دلدادۂ فنا
جو خاک وخون میں بھی ہمہ تن غرق نور ہیں
پوچھا جو میں نے کون ہو تم؟ آئی یہ صدا
ہم کشتگان معرکہ کان پور ہیں

انگریزی ترجمہ

I saw some lifeless bodies yesterday,
All pierced through with gaping wounds were they.
And some were children silent as the tomb,
Their tender years reproached their tragic doom.
"We came to build the House of God on high,
But feeling drowsy slept, they seemed to sigh"
"And now we wait till Israfil shall sound,
His clarion which will bring senses round"
And some were young, even in the prime of life,
Versed in world`s ways, skilled in stress and strife.
Their singing youth in tones of burning pride,
Confessed the guilt which weakness strove to chide.
Their haughty valour made their brawny breast,
A living shield for lance set in rest.
Their eager souls forestalled their ghostly fate,
Their right hands cut their throats, they scorned to wait.
And some were old men here not with rage and toil,
Who moved to shuffle off this mortal coil.
And as they rolled in dust and blood it seemed,
A halo round their beaming bodies gleamed.
I said "who are you" and could say no more,
A voice replied, "The victims of Cawnpore". (17)

انجمن ترقی اردو

۴؍جنوری ۱۹۰۳ء کو انجمن ترقی اردو کا قیام عمل میں آیا۔ پروفیسر ٹی ڈبلیو آرنلڈ صدر اور علامہ شبلی اس کے پہلے سکریٹری منتخب ہوئے۔ چنانچہ علامہ نے انجمن کو باقاعدہ ادارہ بنانے میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ البتہ راقم کی کتاب ''نوادرات شبلی'' کی ۲۰۱۷ء میں اشاعت کے بعد انجمن ترقی اردو سے متعلق علامہ شبلی کی درج ذیل نادر تحریر دستیاب ہوئی ہے۔ افادیت کے پیش نظر اسے قارئین کی نذر کیا جاتا ہے۔

''انجمن ترقی اردو نے اردو کی ترقی دینے کے لئے جو تدبیریں اختیار کی ہیں ان میں ایک یہ ہے کہ جن مضامین پر نئی تصنیفات کی ضرورت ہے وقتاً فوقتاً ان کو اخبارات کے ذریعہ سے مشتہر کرے گی۔اس کے ساتھ مصنّفین کو مواد تصنیف اور طریقہ تصنیف کے متعلق ہر قسم کی ہدایت کرے گی اور اعانت دے گی۔مجلس انتظامی نے بالفعل جن مضامین کو منتخب کیا ہے حسب ذیل ہیں:

۱۔تاریخ التاریخ۔یعنی فن تاریخ (خاص مسلمانوں کی تاریخ مقصود ہے۔) کب اور کن اسباب سے پیدا ہوا!، کیونکر درجہ بدرجہ بڑھا!، کتنے دور قائم ہوئے! ہر دور کی کیا خصوصیات ہیں؟، ملکی اور مذہبی حالت نے اس فن پر کیا کیا اثر پیدا کئے؟، مشاہیر مورخین کے نام، ان کی مختصر سوانح عمریاں، ان کی خصوصیات، کتب تاریخ کی فہرست آج جو کتابیں دنیا کے کتب خانوں میں موجود ہیں ان کی فہرست وغیرہ وغیرہ۔

۲۔ ہندو عہدہ داران سلطنت تیموریہ۔اس کتاب میں ان تمام ہندو عہدہ داران کے حالات ہوں گے جو سلطنت تیموریہ میں بڑے بڑے معزز عہدوں پر ممتاز تھے اور جن کا اعزاز درجہ اور حقوق تمام بڑے بڑے مسلمان ارکان سلطنت کے برابر تھے۔

۳۔قاموس النساء: جس میں ان مراتب کی تفصیل ہو گی۔اسلام سے پہلے عورتوں کی کیا حالت تھی اور اسلام نے کیا اصلاحیں کیں؟، اسلام نے عورتوں کو کیا حقوق عطا کئے، مختلف زمانوں میں عورتوں کے تمدن، تعلیم، آزادی، معاشرت، وضع، لباس وغیرہ کی جو حالت تھی اس کی تفصیل، ان میں سے ہر تصنیف پر معتدبہ اور کافی صلہ دیا جائے گا جس کی مقدار آیندہ متعین کی جائے گی۔جو حضرات ان مضامین پر لکھنا چاہیں سکریٹری سے خط کتابت فرمائیں۔

شبلی نعمانی
سکریٹری انجمن اردو
حیدر آباد(۱۸)

الامام ابن تیمیہ الحرانی۔مجدد القرنہ

علامہ شبلی نعمانی کے متعدد علمی، دینی، تاریخی اور تحقیقی مقالات کتابچہ کی صورت میں مختلف مکتبات سے علاحدہ شائع ہوئے ہیں اور واقع میں یہ بڑا مفید سلسلہ ہے۔ علامہ شبلی کے اس طرح کے کئی کتابچوں کا ذکر راقم نے ''کتابیات شبلی'' میں مدونہ کتب و رسائل کے ذیل میں کیا ہے۔ گذشتہ سال ''جہان شبلی'' کے عنوان سے ماہنامہ اردو دنیا میں راقم نے جو مضمون لکھا تھا، اس میں بھی بعض کتابچوں کا ذکر ہے۔ حال ہی میں معلوم ہوا ہے کہ علامہ شبلی کے ایک اور مشہور مقالہ ''امام ابن تیمیہ حرانی'' [مطبوعہ: ماہنامہ الندوہ جلد ۵ شمارہ ٦] کو دارالعلم بمبئی نے کتابی صورت میں شائع کیا ہے۔ اس میں افادیت کے پیش نظر امام ابن تیمیہؒ پر مولانا الطاف حسین حالیؒ [۱۸۳۷-۱۹۱۴ء] کے مضمون کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ یہ اردو میں اپنے موضوع پر اولین مقالہ ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ امام ابن تیمیہ کو اردو داں حلقہ میں سب سے اول علامہ شبلی نے متعارف کرایا۔ ٦٠ رصفحات پر مشتمل اس ترجمہ کا سنہ اشاعت ۲۰۱٦ء ہے۔ اس کے مرتب محمد تنزیل الصدیقی الحسینی ہیں۔ لائق مرتب نے تقدیم کے ساتھ جابجا مفید حواشی بھی لکھے ہیں۔ جس سے اس کی افادیت میں مزید اضافہ ہوگیا ہے۔ ایک اطلاع کے مطابق اس قیمتی مقالہ کو ڈاکٹر محمد اکرم ندوی استاذ اکسفوڈ یونیورسٹی نے عربی مبین میں منتقل کر دیا ہے، جسے دارالبشائر الاسلامیہ نے شائع کیا ہے۔

تعلیقات و حواشی

(۱) ایک مشرقی کتب خانہ، مترجمہ سید مبارز الدین رفعت، انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ، ص ۸-۹

(۲) مجالس حکیم الامت از مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ۔ ماہنامہ البلاغ، کراچی، مارچ ۱۹۷۰ء ص ۳۹-۴۰، ومجالس حکیم الامت ص ٦٧، تحریر و ترتیب مولانا مفتی محمد شفیع، دارالاشاعت کراچی، ۱۳۹٦ھ

(۳) حیات شبلی ص ٦۵۹، مکتبہ دارالمصنفین اعظم گڑھ، طبع جدید ۲۰۱۵ء

(۴) ہفت روزہ چٹان لاہور، ۲۹ راگست ۱۹۸۳ء۔ ص ۳۹

(۵) ماہنامہ الحمراء، لاہور، دسمبر ۲۰۰۳ء۔ ص ۱۴

(٦) ڈاکٹر امرت لعل عشرت، سخنوران بنارس ص ۱۳۱، اکرام حسین لیتھو الکٹرک مشین پریس پر ہلاد

گھاٹ، وارانسی، ۱۹۶۸ء

(۷) ماہنامہ الحمراء، لاہور، ستمبر ۲۰۰۴ء ص ۲۰

(۸) ایضاً ص ۲۱

(۹) روزنامچہ سیاحت، ص ۱۶۳

(۱۰) ایم اے او کالج میں علامہ شبلی کے لائبریرین ہونے کا ذکر اس کے علاوہ اور کہیں نظر سے نہیں گذرا، چونکہ سرسید نے اپنی ذاتی لائبریری شبلی کے سپرد کر دی تھی اس لئے ممکن ہے علام شبلی نے خود سے یہ ذمہ داری اپنے سر لے لی ہو۔

(۱۱) مرد درویش (خواجہ غلام الثقلین) خواجہ غلام الحسنین، ص ۱۱۔ سرفراز پریس لکھنو

(۱۲) زمیندار، لاہور، یکم دسمبر ۱۹۱۳ء، ص ۳

(۱۳) زمیندار، لاہور، ۱۵ر دسمبر ۱۹۱۳ء، ص ۳

(۱۴) یہ رپورٹ اور علامہ شبلی نعمانی کا مراسلہ دونوں زمیندار لاہور میں شائع ہوئے ہیں۔ جناب احمد سعید صاحب نے اس کا عکس بھیجا تھا، مگر وہ ناصاف تھا۔ تاریخ بھی نہیں پڑھی جا سکی۔ مراسلہ بھی نامکمل ہے۔ قیاس ہے کہ یہ مراسلہ اگست ۱۹۱۳ء سے لے کر جنوری ۱۹۱۴ء کے درمیان شائع ہوا ہے۔ تلاش بسیار کے باوجود زمیندار کا وہ شمارہ ابتک دستیاب نہیں ہو سکا۔

(۱۵) میمونہ سلطان شاہ بانو، سیرت طیبہ ص ۱۰، یونیورسل بکس لاہور ۱۹۸۲ء

(۱۶) ڈاکٹر عظیم الدین امروہوی، قصیدہ نگاران امروہہ ص ۲۱۴، مرثیہ سینٹر دہلی، ۲۰۱۶ء

(۱۷) مرغزار، ظفر علی خاں نمبر، شیخوپورہ گورنمنٹ کالج، ۱۹۸۱ء، ص ۲۸۸، بحوالہ بازیافت (۲۷) شعبہ اردو اورینٹل کالج لاہور ص ۱۲۳-۱۲۴

(۱۸) روزنامہ زمیندار، لاہور ۸ر مارچ ۱۹۰۴ء

○○○

[۱۰]

علامہ شبلی کی بدولت
دارالمصنّفین

دارالمصنّفین علامہ شبلی کی علمی، ادبی، تحقیقی، تعلیمی اور مذہبی زندگی کی عظیم الشان یادگار ہے۔ ان کے تخیلات اور تمناؤں کی حقیقی تعبیر ہے۔ اس کا قیام ان کی زندگی کا آخری، اہم اور مہتم بالشان کارنامہ ہے۔ اور دارالمصنّفین اب ہندوستان کے مسلمانوں کا مایہ ناز علمی و تصنیفی ادارہ ہی نہیں بلکہ ایک زندہ و تابندہ تحریک اور علوم اسلامیہ کی شاندار مملکت ہے۔

علامہ شبلی کی شخصیت قدیم و جدید کے سنگم کی سی تھی۔ بقول مولانا سید سلیمان ندوی ''وہ قدیم اور مذہبی علوم کے عالم بھی تھے اور جدید علوم کے بہت سے آراء و خیالات کے واقف کار بھی تھے۔'' ان کا سب سے اہم کارنامہ قدیم وجدید کے درمیان کی خلیج کو پاٹنا ہے۔ انھوں نے ان دونوں میں ہم آہنگی اور قربت و تعلق پیدا کرنے کی بھرپور کوشش کی اور اس مقصد کے حصول کے لیے مسلسل ۳۲ ربرس تک جدوجہد کی۔ اور مولانا سید سلیمان ندوی کے الفاظ میں ''ہندوستان اور ہندوستان سے باہر کی اسلامی دنیا کو اپنے قلم کی روانی سے سیراب، اپنی شعلہ نفسیوں سے گرم اور اپنی نواسنجیوں سے پرشور رکھا۔''

علامہ شبلی کی خواہش و تمنا صاف اور واضح تھی کہ علماء کی ایک ایسی جماعت قائم کی جائے جو اس نئے زمانے میں اسلام کی نئی ضروریات کو پورا کرے۔ یعنی اسلامی عقائد، اسلامی تاریخ و علوم اور اسلامی تہذیب و تمدن کو ان کی بنیادی خصوصیات کے ساتھ نئے معیار و مذاق اور عصری تقاضوں کے مطابق پیش کیا جائے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس نئے طرز سے اسلام کی تبلیغ و اشاعت زیادہ موثر انداز میں کی جاسکتی تھی۔

اس مقصد کی برآری کے لئے انہوں نے تحریک ندوہ میں شمولیت اختیار کی اور اسی خاص مقصد کے حصول کے لیے ان کے ذہن میں دارالمصنّفین کا تخیل آیا تھا۔

دارالمصنّفین کا تخیل علامہ شبلی کے ذہن میں ایک خاص تمثیل کی شکل میں آیا۔ وہ اپنے عہد کے حالات اور علمی ضروریات کو عہد عباسیہ کے مثل تصور کرتے تھے۔ عہد عباسیہ میں نئے حالات اور نئی ضروریات کے مطابق اسلامی علوم وفنون کی نئے سرے سے تدوین وترتیب کی ضرورت محسوس کی گئی۔ چنانچہ بنوعباس نے اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے اپنی دولت وثروت اور حکومت کی بدولت بغداد میں بیت الحکمت قائم کیا اور اہل علم وفضل ودانش کی ایک نامور جماعت کے ذریعہ مختلف علوم وفنون کی تدوین کرائی۔ مختلف زبانوں کی کتابوں کے ترجمے کرائے اور ترقی پذیر عربی زبان وادب کے خزانہ کو بے مثال بنا دیا۔ یہ کہنا قطعی مبالغہ نہ ہوگا کہ دولت عباسیہ نے اسلامی علوم وفنون کی سادہ دیواروں پر ایسی نقاشی اور مینا کاری کی جس سے علوم وفنون کا بازار آراستہ وپیراستہ ہوگیا۔

علامہ شبلی نے بھی اپنے عہد میں اسی ضرورت کو محسوس کیا اور اس اہم فریضہ وقت کی ادائیگی کے لیے اپنے خاص اور باصلاحیت تلامذہ کو تیار کیا۔ ان کی خواہش تھی کہ

۱۔ فلسفہ حال کے اصول اور ان کا معتد بہ حصہ مکمل اردو زبان میں منتقل ہو۔

۲۔ یہ تنقیح ضروری ہو کہ فلسفہ حال کے وہ کون سے مسائل ہیں جو مذہب کے خلاف اور قابل رد ہیں اور کن مسائل کو مذہب سے منطبق کیا جا سکتا ہے۔

۳۔ ان کا خیال تھا کہ جس قسم کے مضامین پر یورپ میں تصنیفات ہورہی ہیں اور جن میں اسلامی تصنیفات بھی موجود ہیں، ان میں موازنہ کرکے بتایا جائے کہ مسلمانوں کا طرز تصنیف کیا تھا اور یورپ کا طرز تصنیف کیا ہے۔ مثلاً اسماء الرجال، معانی و بلاغت اور تحقیقات مذہب میں عربی زبان میں کثرت سے تصنیفات موجود ہیں۔ ان ہی مضامین نے یورپ میں نئے نئے اسلوب اختیار کیے ہیں۔ موازنہ کرکے بتانا چاہیے کہ دونوں کی مختلف خصوصیات کیا ہیں اور کس کو کس حیثیت سے ترجیح دی جائے۔

۴۔ خالص اسلامی علوم مثلاً کلام، فقہ، اصول، تفسیر وغیرہ کی تاریخ اس محققانہ طرز پر

مرتب کی جائے، جس سے معلوم ہو کہ یہ علوم کب پیدا ہوئے، کیونکر بڑھے، کس کسی زمانے میں کیا کیا باتیں اضافہ ہوتی گئیں اور کن اسباب سے ہوئیں، ان کا کس قدر حصہ صحیح ہے اور کس قدر تنقید و اصلاح کا محتاج ہے۔

۵۔ فارسی اور عربی شاعری اور انشا پردازی کی تاریخ بھی لکھی جائے۔

۶۔ جن نئے عنوانوں پر یورپ میں مضامین لکھے جارہے ہیں ان کو اردو زبان میں ترجمے کے ذریعہ سے لایا جائے۔

۷۔ مسلمانوں کی تہذیب وتمدن کا تاریخی نقطۂ نظر سے جائزہ بھی ضروری ہے۔ مثلاً انتظام عدالت، محاصل، پبلک ورکس، تعلیمات، تجارت، فوجی نظم ونسق، معاشرت، غرض اس قسم کے تمام امور کی نسبت مورخانہ طور پر لکھا جائے کہ مسلمانوں نے ان چیزوں میں کہاں تک ترقی کی اور کس کس عہد میں کیا کیا اضافہ ہوا۔

علامہ شبلی کی یہ بھی خواہش تھی کہ تغیر پذیر حالات وضروریات کے مطابق تصنیف وتالیف و ترجمہ اوران کے طبع واشاعت کا اہتمام ہو۔ ظاہر ہے یہی دارالمصنّفین کا تخیل تھا جو ان کے ذہن میں اس طرح آیا کہ اس کے مطابق دارالمصنّفین کو عباسی بیت الحکمت کا مثنی اور جدید قالب قرار دیا جاسکتا ہے۔ البتہ یہ فرق اگر ملحوظ رکھا جائے کہ آل عباس صاحب تخت وتاج اور علامہ شبلی ایک گدائے بے نوا تھے تو دارالمصنّفین کا تخیل، قیام اور مقاصد کے حصول کی اہمیت ''بیت الحکمت'' سے کہیں زیادہ حوصلہ منداور قابل قدر ہو جاتی ہے۔

دارالمصنّفین کا خیال علامہ شبلی کے ذہن کے کسی گوشہ میں عرصہ سے موجود تھا، مگر اس کا پہلا اظہار انھوں نے مارچ ۱۹۱۰ء میں ندوۃ العلماء کے اجلاس دہلی میں کتب خانہ ندوہ کی ضرورت کے سلسلہ میں کیا۔ دارالعلوم کی رپورٹ جو انھوں نے لکھ کر پیش کی تھی، اس میں انھوں نے بصراحت لکھا کہ:

> ''قومی اور مذہبی ضروریات میں جس قدر ایک قومی مدرسہ، ایک قومی کالج ایک اور قومی یونیورسٹی کی ضرورت ہے، اسی قدر ایک قومی کتب خانہ اعظم کی بھی ضرورت ہے۔ اگر مسلمانوں کے مذہب، مسلمانوں کے علوم، مسلمانوں کی قومی تاریخ کو زندہ

رکھنا ہے تو ضروری ہے کہ ایک ایسا کتب خانہ قائم کیا جائے جس میں علوم مذہبی کے متعلق نادر اور بیش بہا تصانیف موجود ہوں۔ جس میں مسلمانوں کے خاص ایجاد کردہ علوم وفنون کا کافی سرمایہ ہو جس میں ہر فن کے متعلق وہ تمام کتابیں موجود ہوں جو اس فن کے دور ترقی کے مدارج ہیں، جس میں قدماء کے عہد کی یادگاریں ہوں اور ان سب باتوں کے ساتھ یہ کتب خانہ کسی کا ذاتی نہ ہو بلکہ وقف عام ہوتا کہ تمام ہندوستان کے مسلمان اور بالخصوص اہل قلم اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔ یہ تجویز کہ ندوہ میں ایک دائرہ تصنیف وتالیف ہو، جس طرح یورپ میں اکیڈمیاں ہوتی ہیں۔ اسی وقت پوری ہوسکتی ہے، جب ایک عظیم الشان کتب خانہ قائم کردیا جائے''۔(۱)

ابھی یہ منصوبہ زیر غور ہی تھا کہ ندوۃ العلماء میں اختلاف وانتشار کا آغاز ہوا جو علامہ شبلی کی سخت مخالفت تک جا پہنچا اور جس کی وجہ سے بالآخر علامہ شبلی بددل ہوکر اس کی معتمدی سے مستعفی ہوگئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ندوہ میں دارالمصنّفین کے قیام کی تجویز بھی اس وقت نامکمل رہ گئی۔ لیکن ندوہ سے اس افسوسناک علیحدگی کے بعد بھی دارالمصنّفین کا خیال اور اس کے قیام کی تجویز علامہ شبلی کے دل سے نہ گئی، بلکہ انھوں نے اسے اپنی زندگی کا آخری میدان عمل اور زمرہ مصنّفین کی دائمی خدمت قرار دیا اور اس کے قیام کا قطعی فیصلہ کیا۔ چنانچہ مولانا ابوالکلام آزاد کے الہلال میں ۱۱؍ فروری ۱۹۱۴ء کو اس کے قیام کی تجویز پیش کی جس میں لکھا کہ:

''خدا کا شکر ہے کہ ملک میں تصنیف وتالیف کا مذاق پھیلتا جاتا ہے اور قابل قدر ارباب قلم پیدا ہوتے جاتے ہیں، لیکن بایں ہمہ اس گروہ میں زیادہ تعداد ان لوگوں کی ہے جن کو مصنف کے بجائے مضمون نگار یا انشاء پرداز کہنا زیادہ موزوں ہوگا کیونکہ ان کی مستقل تصنیفیں نہیں بلکہ معمولی رسالے یا مضامین ہیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اعلیٰ درجہ کی تصنیف کے لیے جو سامان درکار ہے وہ مہیا نہیں ہے۔ ان میں سے اکثر کے پاس کتابوں کا ذخیرہ نہیں، جو انتخاب اور استنباط اور اقتباس کے کام آئے۔ اتفاق سے اگر کوئی مقامی کتب خانہ موجود ہے تو دلجمعی کے اسباب نہیں کہ اطمینان سے چند روز وہاں رہ کر کتابوں کا مطالعہ اور اس سے استفادہ اور نقل و

انتخاب کرسکیں۔ان باتوں کے ساتھ کوئی علمی مجمع بھی نہیں کہ ایک دوسرے سے مشورہ اور تبادلہ خیالات ہوسکے۔ان مشکلات کے حل اور تصنیف و تالیف کی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ ایک وسیع دارالتصنیف امور ذیل کے موافق قائم کیا جائے۔

۱۔ایک عمدہ عمارت دارالتصنیف کے نام سے قائم کی جائے،جس میں ایک وسیع ہال کتب خانہ کے لیے ہواور جس کے عوالی میں ان لوگوں کے قیام کے لیے کمرے ہوں جو یہاں رہ کر کتب خانہ سے فائدہ اٹھانا اور تصنیف و تالیف میں مشغول رہنا چاہتے ہیں۔

۲۔یہ کمرے خوب صورت اور خوش وضع ہوں اور ان مشہور مصنّفین کے نام سے موسوم ہوں جو تصنیف کی کسی خاص شاخ کے موجد اور بانی ہوں۔

۳۔ایک عمدہ کتب خانہ فراہم کیا جائے جس میں کثرت تعداد ہی پر نظر نہ ہو بلکہ یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ جس فن کی کتاب ہو نادر اور کمیاب ہو۔

۴۔تصنیفی وظائف قائم کیے جائیں اور وظیفہ عطا کنندہ کے نام سے موسوم کیا جائے۔یہ وظائف یا ماہوار ہوں گے یا کسی تصنیف و تالیف کے صلہ کے طور پر دئے جائیں گے۔

۵۔جو لوگ کم از کم یک مشت پانچ سو روپیہ عطا فرمائیں گے ان کے نام اس عمارت پر کندہ کیے جائیں گے۔میں یہ تجویز بالکل ایک سرسری صورت میں پیش کرتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ سر دست محض ایک خاکہ کے طور پر اس کی بنیاد قائم ہو جائے جو رفتہ رفتہ خود بخود وسعت حاصل کرتی جائے گی۔"(۲)

اس اعلان کا علامہ شبلی نے انگریزی میں ترجمہ بھی کرایا اور اپنے احباب خاص اور دوسرے اہل علم خصوصاً اپنے تلامذہ کے پاس اس کے اغراض و مقاصد کی وضاحت و تفصیل سے لبریز خطوط روانہ کرنا شروع کیے۔تجویز و اعلان کے بعد اب یہ مسئلہ درپیش تھا دارالمصنّفین کہاں قائم کیا جائے۔علامہ شبلی کے چہیتے شاگرد مولانا مسعود علی ندوی جن کی انتظامی صلاحیتوں کے خود علامہ شبلی بھی قائل تھے،ان کا خیال تھا کہ دارالمصنّفین ندوہ میں قائم کیا جائے۔دراصل یہی تمنا

علامہ شبلی کی بھی تھی، لیکن ندوہ کے تکلیف دہ معاملات کی وجہ سے وہ سمجھتے تھے کہ ان کی یہ آرزو شاید تشنۂ تکمیل ہی رہے، اسی لیے مولانا مسعود علی ندوی کے خط کے جواب میں لکھتے ہیں:

''بھائی وہ لوگ دارالمصنّفین ندوہ میں بنانے کب دیں گے کہ میں بناؤں۔ میری اصلی خواہش یہی ہے لیکن کیا کیا جائے، حالانکہ اس میں انہی کا فائدہ ہے''۔(۳)

علامہ شبلی کے حبیب خاص مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی نے دارالمصنّفین کے قیام کے لیے اپنے وطن حبیب گنج کا انتخاب کیا، لیکن اس پیش کش کا جواب علامہ مرحوم نے یہ لکھ کر دیا کہ ''آپ دارالمصنّفین کو حبیب گنج لے جانا چاہتے ہیں تو حضرت میں اعظم گڑھ کو کیوں نہ پیش کروں۔ اعظم گڑھ میں اپنا باغ اور دو بنگلے پیش کرسکتا ہوں''۔(۴)

بالآخر مرکز دارالمصنّفین کا فیصلہ خود قاضی تقدیر نے کردیا۔ علامہ شبلی کے بھائی مولوی اسحٰق ایڈوکیٹ نے اسی دوران وفات پائی اور وہ اعظم گڑھ آنے پر مجبور ہوئے اور جب یہاں سکون و اطمینان نظر آیا تو اسی شہر میں دارالمصنّفین کے قیام کا فیصلہ کیا۔ مولانا مسعود علی ندوی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

''میں یہاں تکمیل کا درجہ کھول دوں گا، تم طلبہ کے نام سے مطلع کرو اور خود ان کو لکھ دو کہ مجھ سے خط و کتابت کریں۔ میں نے یہاں اپنا مستقل انتظام کرلیا ہے۔ ہر طرح کا آرام اور پھیلاؤ ہے۔ تعلیمی کام شروع ہوگئے ہیں۔ کسی طرف سے کوئی رکاوٹ نہیں۔''(۵)

ایک دوسرے خط میں مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کو لکھتے ہیں:

''دارالمصنّفین کی تجویز میں قطعاً طے کرچکا ہوں۔ کہیں سے بندوبست نہ ہوا تو موجودہ ابتدائی عمارت جس کا تخمینہ پانچ ہزار روپیہ ہے میں خود اپنے پاس سے ادا کردوں گا۔ چھوٹے چھوٹے بنگلے احباب سے بنوالوں گا۔''(۶)

اس زمانہ میں علامہ شبلی ''سیرۃ النبیؐ'' کی تدوین و تالیف میں بھی مصروف تھے اور اسے بہر صورت (گو جان دے کر) پایۂ تکمیل تک پہنچانا چاہتے تھے، اس کے باوجود انھوں نے دارالمصنّفین کے قیام و بنا کا آغاز اس طرح کیا کہ اپنے بنگلہ واقع اعظم گڑھ کے بغل میں اس کے لیے ایک

دارالضیوف بنوایا۔ طلبہ کے رہنے کے لیے مکان کرایہ پر لیا۔ قریب میں ایک سرکاری عمارت تھی اسے خریدنے کی کوشش کی۔ طلبہ کے وظائف کا انتظام کیا۔ نیز دارالمصنّفین کا علمی و تعلیمی خاکہ اور اس کے قواعد و ضوابط بنائے، جس کو حیات شبلی میں مولانا سید سلیمان ندوی نے نقل کر دیا ہے۔

اس کے بعد علامہ شبلی نے اپنے ذاتی باغ اور بنگلے کو خاندان کے اور افراد کی مرضی و اجازت کے بعد برائے دارالمصنّفین وقف کرنا چاہا۔ ابھی یہ وقف نامہ زیر تحریر ہی تھا کہ کاروان علم و فن کا یہ میر قافلہ اپنے مالک حقیقی کے بلاوے پر اس دنیا سے رخصت ہوا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون اور ان کا یہ خیال کہ ''میں عمارت (دارالمصنّفین) کو ان شاء اللہ تعالیٰ پورا کر کے رہوں گا اور شاید وہی میرا مدفن بھی ہو''، سچ ثابت ہوا۔

علامہ شبلی کی وفات ۱۸؍نومبر ۱۹۱۴ء کے تین روز بعد یعنی ۲۱؍نومبر ۱۹۱۴ء کو مولانا حمید الدین فراہی کی دعوت پر مولانا سید سلیمان ندوی کی موجودگی میں علامہ شبلی کے ادھورے کاموں کی تکمیل اور ان کے مشن کو جاری رکھنے کے لیے ایک عارضی مجلس اخوان الصفاء کے نام سے قائم کی گئی، جس کے صدر مولانا حمید الدین فراہی، ناظم مولانا سید سلیمان ندوی۔ مولانا عبدالسلام ندوی، مولانا مسعود علی ندوی اور مولانا شبلی متکلم ندوی اس کے رکن قرار پائے۔ یہی عارضی مجلس اخوان الصفا گویا دارالمصنّفین کا اصل نقطہ آغاز ہے۔

سب سے پہلے مولانا حمید الدین فراہی نے سید صاحب کے تعاون سے ریاست حیدر آباد بھوپال سے علامہ شبلی کو جو وظائف ملتے تھے انھیں دارالمصنّفین کے نام منتقل کرایا اور دارالمصنّفین کی مالی پوزیشن مستحکم کرنے کی کوشش کی۔

علامہ شبلی نے بستر مرگ پر مولانا سید سلیما ندوی سے تکمیل سیرت کی وصیت کی تھی۔ سید صاحب اس وقت دکن کالج پونہ میں السنہ مشرقیہ کے پروفیسر تھے، اپنے استاذ و مرشد کے خوابوں کی تکمیل کے لیے وہاں سے مستعفی ہو کر اعظم گڑھ آ گئے اور دارالمصنّفین کی نظامت سنبھالی۔ مولانا عبدالسلام ندوی نے الہلال کلکتہ کو خیر باد کہہ کر اعظم گڑھ کا رخ کیا۔ مولانا مسعود علی ندوی نے ان احباب کی معیت میں بقیہ زندگی مزار شبلی کے پہلو میں گزارنے کا فیصلہ کیا۔ دارالمصنّفین کی یہی مختصر جماعت اپنی بے سر و سامانی کے باوجود اپنے استاذ کے تخیل و تمناؤں کی تکمیل کے لیے منزل

مقصود کی طرف گامزن ہوئی اور رفتہ رفتہ لوگ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا۔

مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنی بے نظیر علمی صلاحیت سے کام لیتے ہوئے سب سے پہلے تصنیف و تالیف اور نوجوان فضلاء اور رفقائے دارالمصنّفین کی علمی تربیت و اصلاح کا کام شروع کیا اور ان سے گرانقدر مقالات اور کتابیں لکھوائیں جو آج بھی اپنے موضوع پر منفرد خیال کی جاتی ہیں۔ ان کتابوں کی طبع و اشاعت کے لیے ۱۹۱۶ء میں معارف پریس قائم کیا اور اسی سال ماہنامہ معارف جاری کیا۔ دفتر، کتب خانہ اور پریس کی عمارتیں بنوائیں۔ آہستہ آہستہ دارالمصنّفین ایک عالمی شہرت کا حامل تصنیفی ادارہ بن گیا۔

دارالمصنّفین کا بنیادی مقصد تصنیف و تالیف کے لیے اہل علم کی تربیت کرنا، بلند پایہ کتابوں کی تصنیف و تالیف و ترجمہ اور ان کے طبع و اشاعت کا انتظام کرنا تھا۔ چنانچہ اس مقصد کے حصول کے لیے ۱۹۱۵ء میں جب دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کے نام سے اس ادارہ کی رجسٹری کرائی گئی تو اس کے مندرجہ ذیل مقاصد قرار پائے:

۱۔ ملک میں اعلیٰ مصنّفین اور اہل قلم کی جماعت پیدا کرنا۔

۲۔ بلند پایہ کتابوں کی تصنیف و تالیف اور ترجمہ کرنا۔

۳۔ ان کی اور دیگر علمی و ادبی کتابوں کی طبع و اشاعت کا انتظام کرنا۔

ان مقاصد کی مکمل حصولیابی کے لیے دارالمصنّفین کو مختلف شعبوں میں تقسیم کیا گیا اور اس کے مندرجہ ذیل شعبے قرار پائے۔

(۱) دارالتصنیف (۲) دارالاشاعت (۳) دارالطباعت (۴) دارالکتب (۵) شعبہ رسالہ معارف (۶) شعبہ تعمیرات

دارالتصنیف

دارالمصنّفین کے اس سب سے اہم علمی شعبے نے تصنیف و تالیف کا فریضہ انجام دیا۔ نوجوان فضلاء اور اہل علم کی تربیت کی اور بلاشبہ اسی کی بدولت ملک میں سنجیدہ علمی فضا نے نشو ونما پائی۔ اس شعبے کا آغاز مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالسلام ندوی سے ہوا، بعد میں دوسرے

اہل قلم آتے گئے اور اس میں اضافہ ہوتا گیا۔

دارالمصنّفین کے پہلے ناظم سید سلیمان ندوی تھے۔ وہ دارالمصنّفین سے ۱۹۴۴ء تک وابستہ رہے۔ اس طویل عرصہ میں انھوں نے اس ادارہ کو بام عروج پر پہنچانے میں کوئی کسر باقی نہ رکھی۔ اس کی تعمیر و ترقی اور سیرت نبوی کی تصنیف و تالیف کے علاوہ متعدد معرکتہ الآرا کتابیں سپرد قلم کیں۔ جو نہ صرف دارالمصنّفین کا بلکہ ملت کا بڑا قیمتی سرمایہ ہیں۔

۱۹۴۴ء میں مولانا سید سلیمان ندوی بھوپال چلے گئے اور وہاں کے قاضی القضاۃ مقرر ہوئے، لیکن دارالمصنّفین سے ان کا تعلق پوری طرح باقی رہا۔ اسی دوران تقسیم وطن کا حادثہ پیش آیا اور وہ بعض ناگزیر حالات کی وجہ سے پاکستان چلے گئے اور پھر اسی کی خاک کا پیوند ہوئے۔

کتنا بلند ظرف تھا عالی وقار تھا
سرمایہ دار فن تھا مگر خاکسار تھا

ان کی ہجرت کے بعد مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی نے دارالمصنّفین کی نظامت سنبھالی اور اس دور پر آشوب میں دارالمصنّفین کی کشتی کو ہر آندھی طوفان سے محفوظ رکھا اور آخری دم تک دارالمصنّفین کے مقاصد کے حصول میں مصروف رہے۔ ۱۹۷۴ء میں ان کی وفات کے بعد جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم نے دارالمصنّفین کے کاموں کی ذمہ داری اٹھائی اور اسے آخری سانس تک بحسن و خوبی انجام دیتے رہے اور پھر یہ ذمہ داری مولانا ضیاء الدین اصلاحی صاحب بطریق احسن انجام دیتے رہے۔ افسوس فروری ۲۰۰۸ء میں انہوں نے بھی جنت کی راہ لی۔ اب اس کشتی کو پروفیسر اشتیاق احمد ظلی صاحب پارلگا رمیں کوشاں ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی عمر و صحت میں برکت دے۔

دارالمصنّفین کے قیام کو ایک صدی سے زائد کا عرصہ گزر چکا ہے، مگر وہ آج بھی اپنے مقاصد کے حصول و تکمیل میں مسلسل مصروف ہے۔ تصنیف و تالیف کا کام تسلسل سے جاری ہے۔ مصنّفین اور اہل قلم کی ذہنی و دماغی اور تصنیفی تربیت بھی ہو رہی ہے مگر پہلے جیسی نہیں۔

دارالمصنّفین نے اپنی صد سالہ زندگی میں علم و فن کی گرانقدر خدمات جس بلند تحقیقی و تصنیفی معیار اور اسلوب و انداز میں انجام دی ہیں، اس کی نظیر عالم اسلام میں بھی مشکل سے ملے گی۔

قرآن وحدیث، سیرت وسوانح، تذکرہ، ادبیات، تاریخ اسلام، تاریخ ہند، اسلامی علوم وفنون کی تاریخ اور اسلامی تہذیب وتمدن پر تقریباً تین سو سے بلند پایہ اور معرکہ آراء کتابوں کی تصنیف و تالیف اور ترجمہ اس دعویٰ کے ثبوت کے لیے کافی ہیں۔

دارالطباعت

اس شعبہ میں طباعت کا کام ہوتا ہے۔ دارالمصنّفین کا اپنا پریس ہے جو اس کی مطبوعات کو چھاپتا ہے۔ جون ۱۹۱۶ء میں معارف پریس کے نام سے اس کا قیام عمل میں آیا۔ ابتدا میں لیتھو پریس تھا۔ پھر دو مشینیں اور آ گئیں اور ہاتھ کے بجائے بجلی سے کام ہونا شروع ہوا۔

معارف پریس حسن طباعت کے لیے ملک میں بھر میں معروف تھا، مگر اب اس کی مشینیں پرانی ہوگئی ہیں، اس لیے طباعت متاثر ہو رہی ہے۔ نئے آفسٹ پریس کی ضرورت ہے، جس سے معارف پریس کے حسن طبع کی روایت کو باقی رکھا جا سکے۔

رسالہ معارف

رسالہ معارف پر آئندہ صفحات میں ایک مستقل مضمون شامل ہے۔

دارالکتب

علمی وتصنیفی کام کے لیے کتب خانہ کا ہونا انتہائی ضروری ہے۔ علامہ شبلی نے اپنا ذاتی کتب خانہ ندوہ کو دے دیا تھا۔ اس کے بعد سیرت نبویؐ کی تالیف کے سلسلہ میں جو کتابیں جمع ہوئیں، انھی سے کتب خانہ دارالمصنّفین کا آغاز ہوا۔ علامہ شبلی نے اپنے اعزہ کی کتابوں سے اس میں اضافہ کیا۔ پھر سید صاحب مدۃ العمر اس میں اپنی کوششوں سے اضافہ کرتے رہے۔ اب یہ کتب خانہ ایک لاکھ سے زاید اردو، عربی، فارسی اور انگریزی و ہندی کتابوں پر مشتمل ہے۔ سیکڑوں مخطوطات بھی ہیں، مگر دارالمصنّفین کی وسیع ضروریات کے لیے یہ اب بھی ناکافی ہے۔

دارالمصنّفین کے اس مختصر سے تعارف سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ملک میں وہ اپنی نظیر

نہیں رکھتا۔اس کے پاس اپنے رفقاء(اسکالرز) ہیں۔اپنا کتب خانہ اوراپنا مطبع ہے۔غرض یہ کہ بلند پایہ علمی تحقیقات وتصنیفات کے لیے جن وسائل کی ضرورت ہوتی ہے وہ سب دارالمصنّفین کے پاس موجود ہیں۔اس طرح کا ادارہ کم ازکم پورے عالم اسلام میں آج بھی نظر نہیں آتا۔بظاہر یہ بڑا دعویٰ ہے،لیکن اس کے ثبوت کے لیے عالم عرب کے مشہور عالم شیخ عبدالفتاح ابوغدہ کی یہ شہادت ہمارے دعوے کی تقویت کے لیے کافی ہے۔وہ اپنے سفرنامہ میں لکھتے ہیں:

''میں نے بہت سے ملکوں کی سیاحت کی مگر علم کی مملکت دارالمصنّفین میں دیکھی جس کے قلمرو میں اپنا کتب خانہ اپنے رفقاء اپنا پریس اپنا دفتر، اپنا گھر اور اپنی مسجد ہے۔''(۷)

مزید تفصیلات کے لئے راقم کی کتاب ''دارالمصنّفین کی تاریخی خدمات۔مطبوعہ خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ دیکھی جاسکتی ہے۔

حوالے

(۱) بحوالہ حیات شبلی ص۶۹۰-۶۹۱

(۲) الہلال کلکتہ ۱۱رفروری ۱۹۱۴ء

(۳) مکاتیب شبلی ج۲ص ۱۲۷۔بنام مولانا مسعودعلی ندوی

(۴) ایضاً ج۱ص ۲۰۹

(۵) ایضاً ج۲ص ۱۳۸

(۶) ایضاً ج۱ص ۲۰۹

(۷) ماہ نامہ معارف نومبر ۱۹۹۰ء ص۳۶۴-۳۶۵

(ماہ نامہ بزم سہارا،دہلی۔نومبر،دسمبر ۲۰۰۸ء)

[۱۱]

علامہ شبلی کا ایک خواب

معارف

ماہنامہ معارف اعظم گڑھ اور ماہنامہ آج کل دہلی ہماری ادبی صحافت کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آج کل نے اپنے اجرا ۲۵؍نومبر ۱۹۴۲ء سے لے کر آج تک خالص شعر و ادب کی خدمت انجام دی ہے اور بلاشبہ اس کی تاریخ بڑی وقیع اور شاندار ہے۔ وہ اپنی اشاعت کے ۷۵؍سال مکمل کر چکا ہے۔ زیر نظر شمارہ اس کا ڈائمنڈ جبلی نمبر ہے۔ اس موقع پر معاصر ماہنامہ معارف جس کی اشاعت پر ایک صدی گذر چکی ہے اور جو علمی و تحقیقی اور ادبی و تنقیدی لحاظ سے ہماری ادبی تاریخ کا وثیقہ اور بے نظیر رسالہ ہے۔ اس کا تعارف و تجزیہ پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ یہاں یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ رسالہ رہنمائے تعلیم دہلی ۱۱۳؍سال سے نکل رہا ہے سب سے طویل عمر اسی کی ہے، تاہم بلند علمی و تحقیقی مشمولات کے اعتبار سے وہ معارف کا ہم پلہ نہیں۔ معارف نے نہ صرف صدی کی تکمیل کی ہے بلکہ اپنے عہد کے تمام بڑے ادیبوں، شاعروں اور نقادوں کے خیالات کا وہ مرکز بھی رہا ہے۔ اس نے کئی نسلوں کی تربیت اور ذہنی نشو و نما کا فریضہ بھی انجام دیا ہے۔

علامہ شبلی نے دارالمصنفین قائم کیا تو ان کے پیش نظر جو علمی و ادبی منصوبے تھے، ان میں ایک ماہانہ رسالہ معارف کا اجرا بھی تھا۔ اس کا وہ ایک خاکہ بھی تیار کر چکے تھے:

۱۔ نام معارف ہوگا

۲۔ چیف ایڈیٹر شبلی

اسٹاف: مولوی سلیمان، مولوی عبدالماجد، مسٹر حفیظ، مولوی عبدالسلام

۳۔تعداد صفحات تقطیع و کاغذ ۲۰×۲۹ ضخامت ۴۰؍ قیمت ہے۔

تنوعات مضامین: فلسفہ، تاریخ قدیم و جدید، سائنس

ادبیات: شعر، اردو شاعری کی تاریخ اور اسالیب متنوعہ

اقتباسات: مجلّات علمیہ یورپ اور مصر و بیروت

فن تعلیم: کتب نادرہ کا ذکر اور ان کے اقتباسات یا ان پر اظہار رائے

تنقید: کتب یا علوم قدیمہ پر

مصر سے المقتطف، الہلال، المنار اور بیروت سے المقتبس منگوائے جائیں۔ بقیمت یورپ کے علمی پرچے منگوائے جائیں۔

مگر علامہ شبلی کی زندگی نے وفا نہ کی اور وہ اسے شائع نہ کر سکے۔ ان کی وفات ۱۸؍نومبر ۱۹۱۴ء کے تقریباً ۲ سال بعد ان کے جانشین سید سلیمان ندوی [۱۸۸۴-۱۹۵۳ء] نے جولائی ۱۹۱۶ء میں دار المصنّفین [شبلی اکیڈمی] اعظم گڑھ سے اسے جاری کیا۔ معارف اس وقت سے اب تک بلا ناغہ مسلسل شائع ہو رہا ہے۔ ایک صدی پر مشتمل ماہنامہ معارف کی حیثیت کسی انسائیکلوپیڈیا سے کم نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اہل علم و ادب اور ارباب کمال نے اس کی علمی، ادبی، تاریخی اور تنقیدی اہمیت کا ہر دور میں اعتراف کیا۔ علامہ اقبال نے لکھا کہ یہی تو ایک رسالہ ہے جس کے پڑھنے سے حرارت ایمانی میں ترقی ہوتی ہے۔(۱) مولانا ابوالکلام آزاد نے فرمایا کہ یہی تو ایک پرچہ ہے باقی ہر طرف سناٹا ہے۔ بحمد اللہ شبلی مرحوم کی تمنائیں رائیگاں نہیں گئیں۔(۲)

علامہ شبلی نے معارف کے متعدد مقاصد میں ایک بنیادی مقصد شعر و ادب اور تحقیق و تنقید کی خدمت قرار دیا تھا۔ چنانچہ اس کے آغاز ہی سے اس کے مدیروں نے ادبی و تنقیدی نگارشات کو اہمیت دی۔ خوش قسمتی سے اس کے تمام مدیر اہل ذوق اور شعر و ادب کے نکتہ شناس تھے اس لئے دوسرے علوم و افکار کے ساتھ شعر و ادب کو فوقیت دیتے رہے۔ ایک صدی پر محیط ماہنامہ معارف کی ادبی خدمات کو اگر موضوع کے لحاظ سے مرتب کیا جائے تو ادب کے مختلف گوشوں اور پہلوؤں پر سیکڑوں معرکۃ الآرا ادبی، تنقیدی اور تحقیقی کتابیں معرض وجود میں آسکتی ہیں۔

جولائی ۱۹۱۶ء سے اب تک ماہ نامہ معارف اعظم گڑھ کے صفحات میں اردو کے مشاہیر

شعراء کی اہم شعری تخلیقات نظمیں، غزلیں، قطعات وغیرہ شائع ہوکر نہ صرف ان کی شہرت وعظمت میں اضافے کا باعث بنیں بلکہ اہل ذوق کو شاد کام بھی کیا۔ معارف کے شعراء میں علامہ اقبال، اکبرالہ آبادی، اقبال سہیل، عبدالسلام شمیم، مرزا احسان احمد، سجاد انصاری، جگر، اصغر، فانی، فراق، حسرت، یحییٰ اعظمی، نشور واحدی، روش صدیقی، چندر پرکاش جوہر بجنوری اور جگن ناتھ آزاد، ابرار اعظمی اور وارث ریاضی وغیرہ کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ پروفیسر جگن ناتھ آزاد کی مشہور نظم ''بھارت کے مسلماں'' کے جواب میں اسد ملتانی نے جو معرکہ آراء نظم بطور شکریہ لکھی تھی وہ معارف ہی کے ذریعہ منصۂ شہود پر آئی۔ علامہ اقبال کی متعدد اردو و فارسی منظومات معارف میں جلوہ گر ہوئیں۔ ان کی مشہور غزل:

نہ سلیقہ مجھ میں کلیم کا نہ قرینہ تجھ میں خلیل کا
میں ہلاک جادوئے سامری تو قتیل شیوہ آذری

اسی معارف میں شائع ہوئی۔

شعری ادب کے مقابلہ میں معارف نے نثری ادب کی زیادہ خدمت انجام دی۔ اردو کے نامور ترین ادیبوں اور نقادوں کی تحریروں کا ایک بڑا سرمایہ معارف کے صفحات میں محفوظ ہے۔ حالی وشبلی، ڈپٹی نذیر احمد اور منشی ذکاء اللہ کے علاوہ سید سلیمان ندوی، عبدالسلام ندوی، عبدالماجد دریابادی، مہدی افادی، سید عبداللہ، نصیرالدین ہاشمی، شاہ معین الدین احمد ندوی، سید صباح الدین عبدالرحمٰن، اثر لکھنوی، ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر نذیر احمد اور متعدد دوسرے اہل قلم کی ادبی وتنقیدی کاوشوں کی اشاعت کا سہرا بھی معارف ہی کے سر ہے۔ اسی طرح تحقیق وتنقید کے میدان میں اردو کے نامور محققین مثلاً قاضی عبدالودود اور امتیاز علی عرشی وغیرہ نے ماہنامہ معارف کے صفحات میں داد تحقیق دی، جس سے نہ صرف ان کی عظمت کا اعتراف ہوا بلکہ اردو کے تحقیقی ادب میں بھی گراں بہا اضافہ ہوا۔

لسانیات کو اب ایک مستقل اور اہم موضوع کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے، لیکن تقریباً ایک صدی قبل اسے وہ اہمیت اور حیثیت حاصل نہیں تھی جو آج ہے۔ اس لحاظ سے معارف اور معارف کے اہل قلم انتہائی قابل ستائش ہیں کہ ایک صدی قبل لسانیات کے مختلف گوشوں مثلاً رسم خط کی

اجمالی تاریخ، ہندوستان کی مختلف زبانیں، اردو املا، یوروپی الفاظ واعلام، لسانی مسائل، پرانے لفظوں کی نئی تحقیق، سرگذشت الفاظ وغیرہ موضوعات پر گراں قدر مقالے معارف میں شائع ہوئے جن کی بدولت لسانیات کے مختلف پہلوؤں کے مطالعہ وتحقیق کا آغاز ہوا۔ ان تحریروں کو اگر یکجا کر دیا جائے تو نہ صرف لسانیات میں معتد بہ اضافہ ہوگا بلکہ بعض نئی بحثوں کو از سرنو سمجھنے میں بھی مدد ملے گی۔

اردو کی ہمہ گیری کے ذکر کے ساتھ دیگر زبانوں کے اثرات مثلاً اردو پر پنجابی، سندھی، افغانی، پرتگالی، ترکی وغیرہ کے اثرات کی نشاندہی پر مشتمل مضامین ومقالات بھی معارف میں شائع ہوئے اور جن کو معارف کے علاوہ دوسرے معاصر ادبی رسائل میں معارف کے بعد جگہ ملی۔ یہی نہیں اردو ادب کے ساتھ عربی ادب، فارسی ادب وغیرہ پر بیش بہا ذخیرہ معارف کے صفحات میں موجود ہے۔

معارف نے سو سال میں تقریباً چار ہزار مضامین ومقالات مختلف موضوعات پر شائع کئے ہیں، شذرات کے مشمولات، اخبار علمیہ، آثار علمیہ، مکتوبات، ادبیات اور مطبوعات جدیدہ کے علاوہ شذرات کو معارف کا ایک مستقل باب تصور کرنا چاہئے مثلاً شذرات کے تحت سیاسی، ادبی، تعلیمی اور معاشی ومعاشرتی گویا مختلف النوع موضوعات پر شذرے لکھے جاتے رہے ہیں۔ یہ بجائے خود ایک انتہائی معلوماتی تحریروں کا خزانہ ہے، سید سلیمان ندوی کے شذرات تین جلدوں میں شذرات سلیمانی کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ ضرورت ہے کہ دیگر مدیران معارف کے شذرات بھی ایڈٹ کر کے شائع کئے جائیں۔

مقالات معارف کا ذکر اوپر آچکا ہے، البتہ معارف کے ہر شمارے کا پہلا مقالہ سر مقالہ کہلاتا ہے وہ علم وتحقیق کے کسی انتہائی اہم عنوان پر تحقیق وتدوین پر مبنی ہوتا ہے، اور ان مقالات نے ہماری ادبی تاریخ بالخصوص مقالہ نگاری کے میدان میں ایک تاریخ رقم کی ہے۔ باوجود اس کے اب تک ان کی طرف توجہ نہ دی جاسکی ہے نہ کوئی انتخاب ہوا اور نہ ان کے مجموعے شائع کئے گئے۔

اخبار علمیہ میں ہر دور میں علمی خبروں کی اشاعت کا اہتمام کیا گیا اسی طرح آثار علمیہ میں آثار و باقیات کی اشاعت کا اہتمام ہوتا رہا اور یہ وقتی چیزیں نہ تھیں بلکہ ایک صدی کے دورانیے

میں سیکڑوں آثار کو معارف نے نہ صرف محفوظ کیا بلکہ اہل علم اور ارباب ذوق تک پہونچایا، ایک باب اس سے بھی اہم معارف نے قائم کیا جو تا حال جاری ہے اور وہ ہے باب الاستفسار والجواب، اہل علم کے سیکڑوں علمی، ادبی، تاریخی سوالات ملک سے آئے اور معارف کے اہل قلم نے اپنا قیمتی وقت صرف کر کے ان کے جوابات لکھے۔ ان کو بھی اگر جمع کر دیا جائے تو کئی بہترین تاریخی کتابیں مرتب ہو سکتی ہیں۔

علامہ اقبال سے لے کر ڈاکٹر حمید اللہ تک بلکہ ہمارے دور تک کے ممتاز اہل علم اور ارباب کمال کے خطوط کی اشاعت کا بھی معارف نے اہتمام کیا ہے۔ ہزاروں خطوط معارف کی ڈاک اور آثار علمیہ کے تحت شائع ہو چکے ہیں۔ مکتوباتی ادب کا یہ بڑا قیمتی سرمایہ ہے۔ علامہ اقبال کے خطوط اقبال نامہ میں شائع ہو چکے ہیں۔ اسی طرح بعض دوسرے اہل قلم کے خطوط بھی بعض مجموعوں میں آ گئے ہیں۔ راقم نے شبلی کے خطوط بھی مکتوبات شبلی میں جمع کر دئے ہیں، تاہم اب بھی سیکڑوں بڑے عالم و فاضل، دانشور اور اردو کے ادیب و نقاد کے خطوط ترتیب و تدوین اور توجہ کے منتظر ہیں۔ ان کی اشاعت سے مکتوباتی ادب میں گراں قدر اضافہ ہوگا۔

معارف کا ایک بڑا سرمایہ غالبیات ہے۔ پروفیسر شعیب اعظمی نے ایک مضمون میں شبلی کو منکر غالب قرار دیا تھا۔ راقم نے اس کی تردید کی اور جواب میں ایک طویل مقالہ غالب و شبلی لکھا تھا۔ معارف کے ذخیرہ غالبیات سے بھی اس کی تردید ہوتی ہے۔ اس میں غالب کی شخصیت، شاعری اور فکر و فن پر پچاس سے زاید تحقیقی مقالات شائع ہوئے ہیں، جس طرح ماہنامہ آج کل کے غالب سے متعلق مضامین کا انتخاب کئی حصوں میں شائع ہوا ہے، اسی طرح معارف کے مضامین کا بھی شائع کیا جا سکتا ہے۔ معارف نے اس سے بھی آگے بڑھ کر تلامذہ غالب کا تذکرہ اور ان سے متعلق تحقیقات بھی شائع کیں۔ غالب، کلام غالب، تلامذہ غالب و دیگر موضوعات پر سو سے زیادہ کتابوں پر نقد و تبصرہ بھی معارف نے شائع کیا ہے۔ دیوان غالب نسخہ حمیدیہ کا انکشاف بھی معارف سے ہوا۔ اسی طرح غالب کے منظوم رقعہ کا نواب علاء الدین خاں علائی والئ لوہارو کے نام لکھا تھا۔ غالب کا یہ دلچسپ منظوم رقعہ بھی پہلی بار معارف ہی کے صفحات میں اجاگر ہوا۔ سکہ غالب کی بحث و تمحیص کا سلسلہ بھی معارف ہی میں قائم ہوا۔ غرض غالبیات معارف میں بڑا

تنوع ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہماری غالب شناسی کی روایت بغیر اس کے تعارف و تجزیے کے پایہ تکمیل تک نہیں پہنچ سکتی۔

معارف میں غالبیات پر لکھنے والوں میں بڑے اہم نام شامل ہیں۔ مالک رام، خواجہ احمد فاروقی، مولانا عبدالسلام ندوی، پروفیسر محمد مسعود احمد، اکبر حیدری، عبدالماجد دریابادی، محمد علی خاں اثر رام پوری وغیرہ چند اہم نام ہیں۔

غالبیات ہی کی طرح اقبالیات معارف بھی بے حد وقیع اور وسیع ہے۔ اس پر اگر مستقل کام کیا جائے تو کئی کتابیں آسکتی ہیں۔ اقبال کی حیات اور فکر و فن پر معارف میں سو سے زیادہ مقالات شائع ہوئے ہیں اور بڑے اہم اہم مقالہ نگاروں کے قلم سے یہ تحریریں ہیں۔ آزاد ہندوستان کے پہلے اقبال شناس مولانا عبدالسلام ندوی کے متعدد معرکہ آراء مضامین شائع ہوئے ہیں۔ معارف کی اشاعت کا آغاز علامہ اقبال کی زندگی میں ہوا تھا اس لئے وہ نہ صرف دارالمصنّفین کے رکن رہے بلکہ معارف کے مستقل قاری بھی۔ چنانچہ انہوں نے اپنی کئی تخلیقات اشاعت کے لئے مرحمت کیں جن کی تعداد نو ہے۔ اس میں اردو کے ساتھ ان کا فارسی کلام بھی شامل ہے۔ ان کے مدیر معارف کے نام جو خطوط آئے جن کی تعداد ۵۶ ہے، وہ بھی معارف کے صفحات کی زینت بنے۔ اقبال کی مثنوی پر نکلسن اور ڈکنسن نے جو تبصرے اور تجزیے کئے تھے ان کا اردو ترجمہ بھی معارف میں اولاً شائع ہوا۔ گویا اقبال شناسی کا آغاز بھی معارف ہی سے ہوا۔ اس کے علاوہ مطبوعات جدیدہ میں ۱۱۰ر سے زیادہ اقبالیاتی کتب پر تنقید و تبصرہ بھی معارف کی اقبال شناسی کا ایک اہم پہلو ہے۔ ہندوستان و پاکستان کے ممتاز ماہرین اقبالیات کے متعدد مضامین و مقالات معارف کا حصہ ہیں۔ اقبالیات معارف کے تعارف و تجزیے اور اس کی قدر و قیمت کی تعیین کی بھی کوشش اب تک نہیں کی گئی ہے۔

معارف ایک تحقیقی ماہنامہ ہے اس کے مدیروں نے اس کی تحقیقی حیثیت کے تحفظ کی طرف ہمیشہ توجہ دی یہی وجہ ہے کہ سیکڑوں تحقیقاتی مضامین معارف نے شائع کئے۔ معارف کے جائزے کا یہ بھی ایک اہم موضوع ہے۔ اسی طرح تنقید کے مختلف اقسام اور اصول و مبادی پر بھی متعدد مضامین شائع ہوئے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ علم و ادب اور تحقیق و تدوین کا شاید ہی کوئی ایسا پہلو

اور ایسا گوشہ ہو جو معارف کے اہل قلم نے اجاگر نہ کیا ہو۔ سچ یہ ہے کہ معارف ہماری ادبی تاریخ کا بنیادی ماخذ ہے۔ یہاں اگر صرف معارف کی اولیات کا ذکر کیا جائے تو یہ مضمون ناکافی ثابت ہوگا۔ مثلاً: اردو کی اولین منظوم داستان جسے جمیل جالبی نے مثنوی کدم راؤ پدم راؤ کے نام سے مرتب کیا اس کا اولاً ذکر نصیر الدین ہاشمی نے معارف (اکتوبر ۱۹۳۲ء) ہی میں کیا تھا۔ ایک گم نام ہندو دکنی شاعر بالک جی نایک ذرہ کا غیر مطبوعہ کلام (۲۲/۱)، خاور نامہ از کمال خاں رستمی کا تعارف اسی (۲۶/۵) میں شائع ہوا، مصحفی کے قلمی دیوان پنجم کا تعارف قاضی عبدالودود نے معارف ہی کے صفحات میں کرایا۔ (۴۰/۱) احسن القصہ پر بھی پہلا مضمون معارف ہی میں شائع ہوا۔ اسی طرح دیوان خاکی، مثنوی رموز العارفین، فغاں کا قلمی دیوان، فارسی اور دکنی منظومات ارگجہ کا تعارف ضعیفی دکنی کی تصنیف نصیحت مدن، مسکین کی مثنوی بغاوت نامہ، ترین کی قلمی مثنوی شمائل النبی۔ اس جیسے پچاس سے زاید مقالات معارف میں شائع ہوئے، جس میں معارف کو اولیت کا شرف حاصل ہے۔ یعنی ان ادبی کاوشوں کا علم ہمارے ادیبوں اور نقادوں کو معارف سے ہوا۔

تذکرہ نگاری اور اردو شعراء کے قدیم تذکروں کی افادیت ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ معارف میں نہ صرف متعدد شعراء کے تذکرے شائع ہوئے بلکہ قدیم تذکروں کی اہمیت اور افادیت پر تنقیدی مضامین بھی لکھے گئے، جس سے نہ صرف اردو کی وسعت وہمہ گیری میں اضافہ ہوا بلکہ تنقید، متنی تحقیق اور اسلوبیاتی مطالعے کو پر پرواز ملی۔ چونکہ معارف کی اشاعت کی مدت طویل ہے، اس لئے یہ خدمت بھی معارف نے معاصر ادبی رسائل کے مقابلے میں زیادہ انجام دی۔

اجراء سے لے کر اب تک ماہنامہ معارف نے مختلف نشیب وفراز اور حالات کے سرد و گرم دیکھے۔ اردو زبان وادب کے میدان میں افکار ونظریات کی یورش دیکھی۔ اردو کی مختلف تحریکیں برپا ہوئیں۔ مختلف تنظیمیں اور ادارے قائم ہوئے۔ متعدد افراد نے نجی اور ذاتی طور پر خدمت اردو کا بیڑا اٹھایا۔ ان تمام کوششوں اور کاوشوں کی آواز بازگشت معارف کے شذرات میں محفوظ ہے۔ دراصل معارف ہماری ادبی تاریخ کا ایک اہم بنیادی اور مستند ترین ماخذ ہے۔ اس سے استفادہ کئے بغیر یقیناً ہماری ادبی تاریخ نامکمل تصور کی جائے گی۔

بیسویں صدی میں اردو کے سیکڑوں اخبارات اور رسائل وجرائد نکلے اور اپنے اپنے

علاقوں اورحلقوں میں مقبول رہے۔ان کا ذکر بھی معارف کے صفحات میں محفوظ ہے۔معارف سے ان کی سنہ وار فہرست تیار کی جاسکتی ہے۔تقریباً ایک ہزار اخبارات ورسائل کے نام،ان کے مدیروں کے نام، سنہ اشاعت اورمقام اشاعت وغیرہ کی تفصیلات معارف کے اوراق پر ثبت ہیں۔ یہ خود بجائے ایک بڑی ادبی خدمت ہے۔مولانا عبدالماجد دریابادی نے سچ لکھا ہے کہ

> ''آئندہ مورخ کا قلم جب ہندوستان کی علمی ودینی صحافت کی تاریخ لکھے گا تو اسے معارف کو چارو ناچار ایک بلند وممتاز مرتبہ اور ایک سنگ میل کا امتیاز دینا ہوگا اور بتانا ہوگا کہ اس شمع نے کتنے اندھیرے گھروں میں اجالا پھیلایا اور پھر اس ایک چراغ سے کتنے چراغ اور جلائے گئے۔''

ماہنامہ معارف میں روز اول ہی سے مطبوعات جدیدہ پر تنقید وتبصرے کا اہتمام رہا ہے۔ اب تک سات ہزار سے زیادہ علمی، ادبی، تنقیدی، تعلیمی اور تاریخی کتابوں پر نقد وتبصرہ لکھا جا چکا ہے۔انہیں تاریخ وار مرتب کیا جائے تو تصنیف وتالیف کی تاریخ سامنے آجائے اور اگر وضاحتی کتابیات مرتب کی جائے تو مجلدات تیار ہوجائیں۔ ہماری ادبی تاریخ میں اس قدر وسیع ذخیرہ ادب کسی اور رسالے کے صفحات میں شاید ہی موجود ہو۔

معارف کا ایک ادبی امتیاز یہ بھی ہے کہ اس نے ابتداء ہی سے ایک خاص ادبی اسلوب و انداز تحریر اختیار کیا جس پر وہ اب تک قائم ہے۔سیکڑوں اہل علم کی تحریریں معارف میں شائع ہوئیں، لیکن حسن انشا کی دلآویزی اور ادب وتحقیق کی رعنائی کا جوہر ہمیشہ قائم رہا، حتی کہ غیر ادبی موضوعات میں بھی اس دلکشی کا خیال رکھا گیا۔غرض اردو ادب کا شاید ہی کوئی ایسا پہلو ہو جس پر معارف کے اہل قلم نے قلم نہ اٹھایا ہو۔ بلاشبہ معارف تاریخ ادب اردو میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے جسے کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

حوالے

(۱) اقبال نامہ ص۸

(۲) فاران کراچی، دسمبر ۱۹۶۰ء ص۲۲

(ماہ نامہ آجکل، دہلی، جولائی ۲۰۱۷ء)

کتابیات

کتابیات

○ کتب

(آ)

۱۔ آثارِ شبلی، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ،۲۰۱۳ء

۲۔ آغازِ اسلام، ترجمہ بدء الاسلام، میمونہ سلطان شاہ بانو، مطبع سلطانی بھوپال، ۱۹۱۵ء

○ (الف)

۳۔ ادبی آئینے، پروفیسر سید سخی احمد ہاشمی، مکتبہ شاہد کراچی، ۱۹۷۴ء

۴۔ اسلام کی عالم گیر خدمات، علامہ شبلی نعمانی، بساطِ ادب لاہور

۵۔ اشاریہ معارف۔ ڈاکٹر جمشید احمد ندوی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۲۰۱۱

۶۔ افکارِ ذاکر، اختر الواسع، بیگ احساس، مکتبہ جامعہ دہلی، ۲۰۰۵ء

۷۔ اقبال اور پیرویِ شبلی۔ سید افتخار حسین شاہ، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۱۹۷۸ء

۸۔ اقبال اور دبستانِ شبلی، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ، ۲۰۱۵ء

۹۔ اقبال اور مشاہیر، طاہر تونسوی، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۱۹۸۱ء

۱۰۔ الفاروق، علامہ شبلی نعمانی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۲۰۱۲ء

۱۱۔ الفہرست، محمد سجاد مرزا بیگ، نظام دکن پریس حیدرآباد، ۱۹۲۳ء

۱۲۔ انجمن ترقی اردو کی کہانی، مولوی غلام ربانی، انجمن ترقی اردو ہند دہلی، ۱۹۳۹ء

۱۳۔ اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر، علامہ شبلی نعمانی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۱۹۹۹ء

۱۴۔ ایک مشرقی کتب خانہ۔ وی سی اسکاٹ اوکونر، مترجمہ سید مبارز الدین رفعت، انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ، ۱۹۵۰ء

○ (ب)

۱۵۔ باقیاتِ شبلی، مشتاق حسین، آزاد کتاب گھر دہلی، ۱۹۶۴ء

۱۶۔ بیانِ خسرو، علامہ شبلی نعمانی، الناظر پریس، لکھنؤ۔

۱۷۔ بزم رفتگاں، دوم۔سید صباح الدین عبدالرحمٰن، مکتبہ جامعہ دہلی، ۲۰۱۱ء

۱۸۔ بہار۔الیاس احمد، معارف پریس اعظم گڑھ، ۱۹۳۴ء

○ (ت)

۱۹۔ تاثرات۔ملا واحدی، مرتبہ حکیم محمد سعید، ہمدرد اکیڈمی کراچی، ۱۹۷۰ء

۲۰۔ تذکرۃ الشعراء، حسرت موہانی، مرتبہ شفقت رضوی، ادارہ یادگار غالب کراچی، ۱۹۹۹ء

۲۱۔ تذکرہ علمائے ہند۔مولوی رحمان علی، ترجمہ محمد ایوب قادری، مقدمہ ڈاکٹر سید معین الحق
پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی، ۱۹۶۱ء

۲۲۔ تذکرہ نوادر۔ڈاکٹر محی الدین قادری زور، ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد

۲۳۔ تفہیم شبلی، ڈاکٹر ارشاد نیازی، ایم.آر پبلی کیشنز دہلی، ۲۰۱۳ء

○ (ج)

۲۴۔ جہاں گیر اور تزک جہاں گیری، علامہ شبلی نعمانی، وکیل ٹریڈنگ کمپنی امرت سر

○ (ح)

۲۵۔ حیات شبلی، مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۲۰۱۵ء

○ (خ)

۲۶۔ خطوط مشاہیر، مولانا عبدالماجد دریابادی، تاج کمپنی، لاہور، ۱۹۴۵ء

۲۷۔ خلاصہ موازنہ انیس و دبیر، اختر لکھنوی، صدیق بک ڈپو لکھنو

○ (د)

۲۸۔ دارالمصنّفین کی تاریخی خدمات، محمد الیاس الاعظمی، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ
۲۰۰۲ء

۲۹۔ دستاویز، (مصنّفین کے اپنے قلم سے) اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ، ۲۰۱۰ء

○ (ر)

۳۰۔ رپورٹ کارروائی انجمن وقف علی الاولاد، علامہ شبلی نعمانی، آسی پریس لکھنؤ، ۱۹۱۱ء

○ (ز)

۳۱۔ زندہ رود (حیات اقبال کا وسطی دور) جاوید اقبال، شیخ غلام علی، لاہور، طبع دوم، ۱۹۸۳ء

○ (س)

۳۲۔ سخنوران بنارس۔ڈاکٹر امرت لعل عشرت، اکرام حسین لیتھوالکٹرک مشین پریس پرہلاد گھاٹ وارانسی، ۱۹۶۸ء

۳۳۔ سرسیداوران کے نامور رفقا، ڈاکٹر سید عبداللہ، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۱۹۹۴ء

۳۴۔ سیرت طیبہ ترجمہ بدءالاسلام، مترجمہ میمونہ سلطان بانو، یونیورسل بکس لاہور ۱۹۸۲ء

۳۵۔ سیرۃ النبی (اول ودوم)۔علامہ شبلی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، طبع جدید ۲۰۰۳ء

○ (ش)

۳۶۔ شبلی اور جہان شبلی، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ، ۲۰۱۲ء

۳۷۔ شبلی سخنوروں کی نظر میں، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ ۲۰۱۲ء

۳۸۔ شبلی شناسی کے اولین نقوش، ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۲۰۱۶ء

۳۹۔ شذرات شبلی، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۲۰۱۴ء

۴۰۔ شعرالعجم (اول تا پنجم) علامہ شبلی نعمانی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ

○ (ع)

۴۱۔ عظمت رفتہ۔ضیاءالدین احمد برنی، ادارہ علم وفن کراچی، ۲۰۰۰ء

۴۲۔ عظمت کے نشاں۔محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ، ۲۰۰۵ء

۴۳۔ علامہ شبلی کے نام اہل علم کے خطوط، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ، ۲۰۱۳ء

۴۴۔ علم الاقتصاد، علامہ اقبال، اقبال اکادمی پاکستان، طبع دوم

۴۵۔ علم الکلام، علامہ شبلی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۱۹۹۳ء

۴۶۔ علمی نقوش۔پروفیسر غلام مصطفیٰ خاں، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۱۹۸۱ء

○ (ف)

۴۷۔ فتح مکہ، علامہ شبلی نعمانی، اسلامی پبلشنگ کمپنی لاہور

۴۸۔ فتوح الشام منظوم، سید عبدالرزاق کلامی، نول کشور لکھنؤ، ۱۹۰۰ء

۴۹۔ فکر اقبال، خلیفہ عبدالحکیم، بزم اقبال لاہور، طبع ششم، ۱۹۸۸ء

۵۰۔ فلسفہ تعلیم، مترجمہ خواجہ غلام الحسنین پانی پتی، ہلالی پریس، دہلی

۵۱۔ فن تضمین تنقید و تجزیہ۔ ڈاکٹر شیخ عقیل احمد، ساقی بک ڈپو دہلی، ۲۰۰۱ء

۵۲۔ فہرست ممبران و وزیٹران محمڈن اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس مقام امرت سر، مطبع ریاض ہند، علی گڑھ، ۱۹۰۹ء

○ (ق)

۵۳۔ قصیدہ نگاران امروہہ۔ ڈاکٹر عظیم الدین امروہوی، مرثیہ سینٹر دہلی، ۲۰۱۶ء

○ (ک)

۵۴۔ کتابیات شبلی، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۲۰۱۱ء

۵۵۔ کلام شبلی، علامہ شبلی نعمانی، کریمی پریس لاہور

۵۶۔ کلیات باقیات شعر اقبال، ڈاکٹر صابر کلوروی، اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۰۴ء

۵۷۔ کلیات شبلی (اردو) علامہ شبلی نعمانی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۲۰۱۲ء

۵۸۔ کلیات شبلی (فارسی) علامہ شبلی نعمانی دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۲۰۰۴ء

۵۹۔ کلیات باقیات شعر اقبال۔ ڈاکٹر صابر کلوروی، اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۰۴ء

۶۰۔ کلیات مکاتیب اقبال، (اول تا پنجم) سید مظفر حسین برنی، اردو اکادمی دہلی۔

○ (گ)

۶۱۔ گاہے گاہے باز خواں......، ڈاکٹر شعیب اعظمی، الکتاب انٹرنیشنل دہلی، ۲۰۰۷ء

۶۲۔ گلہائے پریشاں۔ الیاس احمد، سہارن پور، ۱۹۵۷ء

○ (م)

۶۳۔ متعلقات شبلی۔ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ، ۲۰۱۰ء

۶۴۔ مجالس حکیم الامت۔مولانا مفتی محمد شفیعؒ، دارالاشاعت کراچی ۱۳۹۶ھ، طبع دوم
۶۵۔ مجموعہ نظم شبلی اردو۔مطبوعہ مولوی مجید حسن، مدینہ پریس بجنور
۶۶۔ مراسلات شبلی، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۲۰۱۶ء
۶۷۔ مرد درویش (خواجہ غلام الثقلین)۔خواجہ غلام السیدین، سرفراز پریس لکھنو
۶۸۔ مسلمانوں کا روشن مستقبل۔سید طفیل احمد منگلوری، کتب خانہ عزیزیہ دہلی ۱۹۴۵ء
۶۹۔ مشاہیر کے خطوط بنام مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۱۹۹۲ء
۷۰۔ مطالعات ومشاہدات، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ، ۲۰۱۰ء
۷۱۔ مقالات شبلی (اول تا ہشتم) علامہ شبلی نعمانی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ
۷۲۔ مکاتیب شبلی (اول ودوم) علامہ شبلی نعمانی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ طبع جدید
۷۳۔ مکتوبات شبلی، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ، اعظم گڑھ، ۲۰۱۲ء
۷۴۔ موازنہ انیس ودبیر، علامہ شبلی نعمانی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۲۰۰۴ء
۷۵۔ موازنہ انیس ودبیر کا تنقیدی مطالعہ، سید ظہور الاسلام، بھوپال بک ہاؤس بھوپال، ۱۹۸۶ء

○ (ن)

۷۶۔ نغمات نور۔نور لدھیانوی، جعفریہ بک ایجنسی لاہور
۷۷۔ نقش ونظر۔پروفیسر مظفر علی شہ میری، معراج پبلی کیشن، تروپتی، آندھرا پردیش ۱۹۹۸ء
۷۸۔ نواب موئد الملک سرسید علی امام، محمد انیس الرحمٰن انیس، علامہ سید سلیمان ندوی اکیڈمی کراچی، ۱۹۸۳ء
۷۹۔ نوادرات شبلی، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ، ۲۰۱۷ء

○ (و)

۸۰۔ وفیات اہل قلم، ڈاکٹر منیر احمد سلیچ، اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۰۸ء
۸۱۔ وفیات معارف، ڈاکٹر سہیل شفیق، قرطاس کراچی، ۲۰۱۴ء

○ (ی)

۸۲۔ یادرفتگاں، مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۱۹۹۳ء

○ **رسائل: خصوصی شمارے**

۸۳۔ صبا، حیدرآباد، شبلی نمبر، ۱۹۵۸ء، مدیر سلیمان اریب

۸۴۔ نقوش۔ شخصیات نمبر (اول ودوم) محمد طفیل، فرید بک ڈپو، دہلی، ۲۰۱۴ء

○ **رسائل : عام شمارے**

۸۵۔ آجکل، دہلی، جولائی ۲۰۱۷ء، مدیر ڈاکٹر ابرار رحمانی

۸۶۔ البلاغ، کراچی، ماہنامہ، مارچ ۱۹۷۰ء

۸۷۔ الحمراء، لاہور، ماہنامہ: دسمبر ۲۰۰۳ء، ستمبر ۲۰۰۴ء

۸۸۔ الموسی، حیدرآباد، ج اش ا-۲

۸۹۔ الندوہ لکھنؤ جون ۱۹۰۵ء، جنوری ۱۹۰۶ء، جولائی ۱۹۰۸ء، اکتوبر ۱۹۰۸ء، فروری ۱۹۱۰ء
فروری ۱۹۱۲ء، مارچ ۱۹۱۲ء،

۹۰۔ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، علی گڑھ: ۱۰/ مارچ ۱۸۹۳ء

۹۱۔ اولڈ بوائے (ماہنامہ) علی گڑھ، فروری ۱۹۱۳ء

۹۲۔ بازیافت۔ ۲۷، اورینٹل کالج لاہور

۹۳۔ چٹان، لاہور: ۲۹/ اگست ۱۹۸۳ء

۹۴۔ زمیندار، لاہور: ۸/ مارچ ۱۹۰۴ء، ۱۷/ اپریل ۱۹۱۲ء، یکم دسمبر ۱۹۱۳ء

۹۵۔ سخن، فیصل آباد۔ سہ ماہی: جنوری تا مارچ ۲۰۲۰ء

۹۶۔ فاران، کراچی، ماہنامہ: دسمبر ۱۹۶۰ء

۹۷۔ محمڈن نیشنل میگزین، سیال کوٹ: یکم اگست ۱۸۹۳ء

۹۸۔ معارف، اعظم گڑھ: جون ۱۹۱۸ء، اکتوبر ۱۹۳۲ء

۹۹۔ نظام المشائخ، دہلی، جنوری ۱۹۱۰ء، مارچ ۱۹۱۰ء

○○○

اشاریہ

بیان شبلی

(۱)

مرتبہ

مولانا عرفات اعجاز اعظمی

اشخاص

کتب ورسائل

○○○

مقامات

○○○

تعارف مصنف

مرتبہ: شائستہ ریاض

نام : محمد الیاس اعظمی

قلمی نام : ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

ولدیت : حاجی عبدالرزاق مرحوم

پیدائش : ۲۳ ؍ستمبر ۱۹۶۶ء، بروز جمعہ، صبح ۳۰-۸ بجے

پتہ : موضع مہراج پور، انور گنج، ضلع اعظم گڑھ، ۲۷۶۰۰۱ (یوپی)

رہائش : **شائستہ منزل**، ۶۴۱۔ پورہ غلامی عقب آواس وکاس شہر اعظم گڑھ

پن ۲۷۶۰۰۱ [یوپی]

تعلیم : ایم اے۔ اردو۔ آگرہ یونیورسٹی آگرہ

پی ایچ ڈی، اردو۔ پوروانچل یونیورسٹی، جون پور

مشغلہ : پرنسپل: پری ہائر سکنڈری اسکول، اعظم گڑھ

رابطہ : +919838573645

ای میل : azmi408@gmail.com

تصنیفات، تالیفات، کتابیات اور تراجم

۱۔ اسہل التجوید۔ (فن تجوید) طبع اول: مکتبہ نعیمیہ مئو، ۱۹۸۶ء

طبع دوم: ادبی دائرہ اعظم گڑھ، ۲۰۰۴ء

طبع سوم: ادبی دائرہ اعظم گڑھ، ۲۰۱۷ء

۲۔ علم الترتیل۔ (فن قرات) دانش بک ڈپو ٹانڈہ، ۱۹۹۶ء

۳۔ تذکرۃ القراء (تذکرہ) دانش بک ڈپو ٹانڈہ، ۱۹۹۶ء

طبع دوم: ادبی دائرہ اعظم گڑھ،۲۰۱۲ء

۴۔ اورنگزیب عالم گیر پر ایک نظر (تدوین) دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ،۱۹۹۹ء

۵۔ علامہ سید سلیمان ندوی بحیثیت مورخ (تاریخ) طبع اول: خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ،۲۰۰۱ء طبع دوم: ادبی دائرہ، اعظم گڑھ۔ جون ۲۰۱۴ء

۶۔ دارالمصنّفین کی تاریخی خدمات۔ (تحقیق) خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ،۲۰۰۲ء

۷۔ اشاریہ ماہنامہ الرشاد۔ ندوۃ التالیف والترجمہ جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ،۲۰۰۴ء

۸۔ موازنہ انیس و دبیر (تدوین) دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ،۲۰۰۴ء

۹۔ عظمت کے نشاں۔ (شخصیات) ادب کدہ، مہراج پور اعظم گڑھ،۲۰۰۵ء

اتر پردیش اردو اکادمی لکھنو انعام۔ ۲۰۰۵ء

طبع دوم: ادبی دائرہ اعظم گڑھ،۲۰۱۰ء

۱۰۔ ساحلوں کے شہر میں (سفرنامہ) طبع اول: ادب کدہ، مہراج پور اعظم گڑھ،۲۰۰۶ء

طبع دوم: ادبی دائرہ اعظم گڑھ،۲۰۱۹ء

۱۱۔ شاہ معین الدین احمد ندوی حیات و خدمات (سوانح) ادبی دائرہ اعظم گڑھ،۲۰۰۷ء

۱۲۔ متعلقات شبلی۔ (شبلیات) ادبی دائرہ اعظم گڑھ،۲۰۰۸ء

اتر پردیش اردو اکادمی لکھنو انعام۔ ۲۰۰۸ء

طبع دوم: ادبی دائرہ اعظم گڑھ، فروری ۲۰۱۱ء

۱۳۔ کاروان رفتگاں، مولانا مجیب اللہ ندوی (تدوین) ندوۃ التالیف والترجمہ اعظم گڑھ،۲۰۰۸ء

۱۴۔ رحمت عالم ہندی (ترجمہ) دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ،۲۰۰۹ء

طبع دوم: دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ،۲۰۱۳ء

طبع سوم: دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ،۲۰۱۷ء

طبع چہارم: دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ،۲۰۲۰ء

۱۵۔ نیو ربی اے ہندو۔ اردو (ترجمہ) اسلامک بک فاؤنڈیشن، دہلی،۲۰۱۰ء

طبع دوم: اسلامک بک فاؤنڈیشن دہلی،۲۰۱۷ء

۱۶۔ مطالعات ومشاہدات۔(شخصیات)ادبی دائرہ،اعظم گڑھ،۲۰۱۰ء

۱۷۔ کتابیات شبلی۔(کتابیات)دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی،اعظم گڑھ،۲۰۱۱ء

۱۸۔ تاریخ اعظم گڑھ۔شاہ افضال اللہ(تدوین)ادبی دائرہ،اعظم گڑھ،۲۰۱۱ء

۱۹۔ شبلی سخنوروں کی نظر میں۔(شبلیات)ادبی دائرہ،اعظم گڑھ،۲۰۱۲ء

اتر پردیش اردو اکادمی لکھنو انعام یافتہ۔۲۰۱۲ء

۲۰۔ مکتوبات شبلی۔(شبلیات)ادبی دائرہ،اعظم گڑھ،۲۰۱۲ء

۲۱۔ کتابیں حصہ اول۔(تبصرے)ادبی دائرہ،اعظم گڑھ،۲۰۱۲ء

۲۲۔ کتابیں حصہ دوم۔(تبصرے)ادبی دائرہ،اعظم گڑھ،۲۰۱۳ء

۲۳۔ آثار شبلی۔(شبلیات) دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ،۲۰۱۳ء

۲۴۔ علامہ شبلی کے نام اہل علم کے خطوط۔(شبلیات)ادبی دائرہ اعظم گڑھ،۲۰۱۳ء

۲۵۔ یگانہ روزگار مولانا عبدالسلام ندوی۔(سوانح)ادبی دائرہ،اعظم گڑھ،۲۰۱۳ء

۲۶۔ عکس واثر۔(تحقیق وتنقید)ادبی دائرہ،اعظم گڑھ،۲۰۱۳ء

۲۷۔ شبلی شناسی کے سو سال۔(شبلیات)ادبی دائرہ،اعظم گڑھ،۲۰۱۴ء

۱۔بہار اردو اکادمی پٹنہ کا اول انعام۔سند نمبر ۲۰۱۴ء/۰۱۰

۲۔اتر پردیش اردو اکادمی لکھنو انعام۔۲۰۱۴ء

۲۸۔ کتابیات مجیب۔(کتابیات)ادبی دائرہ،اعظم گڑھ،۲۰۱۴ء

۲۹۔ شذرات شبلی۔(شبلیات)دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی،اعظم گڑھ،۲۰۱۴ء

۳۰۔ اقبال اور دبستان شبلی۔(تحقیق وتنقید)ادبی دائرہ،اعظم گڑھ،۲۰۱۵ء

۳۱۔ قرائے عظام اور ان کی علمی ودینی خدمات(تذکرہ)ادبی دائرہ،اعظم گڑھ،۲۰۱۴ء

۳۲۔ شبلی اور جہان شبلی۔(شبلیات)ادبی دائرہ،اعظم گڑھ،۲۰۱۵ء

۳۳۔ مراسلات شبلی۔(شبلیات)دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی،اعظم گڑھ،۲۰۱۶ء

۳۴۔ کلیات نشور واحدی حصہ غزلیات(ترتیب)ادبی دائرہ،اعظم گڑھ،۲۰۱۶ء

۳۵۔ محبت نامے۔(مشاہیر کے خطوط بنام ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی)ادبی دائرہ،اعظم گڑھ،۲۰۱۷ء

۳۶۔ نوادرات شبلی۔(شبلیات)ادبی دائرہ،اعظم گڑھ،۲۰۱۷ء
جان گل کرسٹ ایوارڈ۔مغربی بنگال اردو اکادمی کولکاتا۔

۳۷۔ شبلی خود نوشتوں میں۔(شبلیات)ادبی دائرہ،اعظم گڑھ،۲۰۱۸ء

۳۸۔ قد اور سائے۔(تحقیق وتنقید)ادبی دائرہ،اعظم گڑھ،۲۰۱۹ء

۳۹۔ علامہ شبلی کی تعزیتی تحریریں(شبلیات)دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ،۲۰۱۹ء

۴۰۔ نقوش شبلی۔(شبلیات)ادبی دائرہ،اعظم گڑھ،۲۰۲۰ء

۴۱۔ کلام شبلی کے اعلام واشخاص۔(شبلیات)ادبی دائرہ،اعظم گڑھ،۲۰۲۰ء

۴۲۔ بیان شبلی جلد اول(شبلیات)ادبی دائرہ اعظم گڑھ،۲۰۲۱ء

رکن مجلس ادارت ومشاورت :

۱۔شبلی نیشنل کالج میگزین۔اعظم گڑھ
۲۔ماہ نامہ الرشاد اعظم گڑھ
۳۔ماہ نامہ آموزگار،جل گاؤں
۴۔سہ ماہی مجلّہ فکر ونظر اسلام آباد
۵۔سہ ماہی مجلّہ جہات الاسلام لاہور
۶۔ادبی گزٹ مئو
۷۔سہ ماہی تخلیق وتحقیق،مئو
۸۔سہ ماہی رشد وہدایت۔مبارک پور

اعزاز ، انعام ، ایوارڈ :

۱۔رفیق اعزازی : دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی،اعظم گڑھ،۲۰۰۹ء

۲۔افتخار شبلی ایوارڈ : شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ،حیدرآباد،۲۰۱۶ء

۳۔امتیاز شبلی ایوارڈ : شعبہ اردو شبلی نیشنل پی جی کالج،اعظم گڑھ،۲۰۱۷ء

۴۔جان گل کرسٹ ایوارڈ ۲۰۱۷ء: مغربی بنگال اردو،اکادمی،کولکاتا

۵۔مسعود حسن رضوی انعام برائے تحقیق ۲۰۱۸ء : اتر پردیش اردو اکادمی،لکھنو

۶۔سند توصیف : بزم حفیظ جون پوری شیراز ہند جون پور،۲۰۱۹ء

BAYAN-E-SHIBLI–1

by

Dr. Mohammad Ilyas Azmi

اگر غالب اور سرسید احمد خاں کو مولانا حالی ملے تھے تو علامہ شبلی نعمانی کو ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی ملے ہیں۔ اگر فرق ہے تو صرف یہ کہ مولانا حالی غالب کے شاگرد اور سرسید احمد خاں کے دست راست تھے۔ جب کہ ڈاکٹر صاحب کا علامہ سے ایسا کوئی تعلق نہیں ہے۔ حالی نے بلاشبہ 'یادگار غالب' اور 'حیات جاوید' لکھ کر مذکورہ دونوں ہی عظیم شخصیات کی حیات و خدمات کو کچھ اس انداز سے پیش کیا ہے کہ ان پر کام کرنے والوں کے لئے آگے کی راہیں روشن ہوتی چلی جاتی ہیں اور ان کی عظمت کا احساس دل میں جاگزیں ہوتا ہے، مگر ایک سچائی یہ بھی ہے کہ حالی نے یہ کتابیں لکھ کر شاگردی اور دوستی کا حق ادا کیا ہے۔ رہے ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی تو علامہ شبلی نعمانی کی شاگردی تو دور کی بات انہوں نے نہ علامہ کو دیکھا اور نہ ہی ان کے دور کو، مگر ایک سچے اور اچھے شاگرد ہی کی طرح ان کی حیات و خدمات پر ایک نہیں درجن بھر کتابیں لکھ دی ہیں۔ یہ کتابیں علامہ کی زندگی اور ان کی ادبی و مذہبی خدمات کے ان گوشوں کو بھی منور کرتی ہیں جو تاریکی میں چھپے ہوئے تھے۔ ان کی درجن بھر کتابیں 'غالبیات' اور 'اقبالیات' کی طرح اردو ادب میں 'شبلیات' کی اصطلاح کے استعمال کا سبب بن گئی ہیں اور برصغیر ہندو پاک ہی نہیں دنیا بھر میں ڈاکٹر صاحب 'ماہر شبلیات' کے طور پر تسلیم کئے جانے لگے ہیں۔ بلاشبہ شبلیات کے دائرے کو انہوں نے وسیع کیا ہے۔ ان کی نئی کتاب ''بیان شبلی'' ان کے ادبی اور تحقیقی مقالات کا مجموعہ ہے۔ یہ بھی شبلیات میں ایک اضافہ کی حیثیت کا حامل ہے۔

شکیل رشید

ایڈیٹر: ممبئی اردو نیوز

EDUCATIONAL
PUBLISHING HOUSE
New Delhi , INDIA